

# HYDER ALI CD CENTER

email:[hyderaliccenter@gmail.com](mailto:hyderaliccenter@gmail.com)

iran:0098-9356294463

india:0091-40-27061835



[www.hozeh.org](http://www.hozeh.org)

# بَارِهِ بَرِّيْس

عَلَّامَهُ السَّيِّدِ ذِي شَانِ حَمَدْ جَوَادِي

# فہرست مجالس

نمبر شمار	موضوع	مصائب	صفونمبر
۱	شخصیت امام حسین علیہ السلام	مدینہ سے روانگی	۵
۲	انسانی رشته اور عبدیت	جناب ام مسلم سے رخصت	۱۶
۳	ضہانتِ کردار	حضرت حُرَيْثٌ	۳۰
۴	اسلوپِ کلام پر بحث	حضرت وہبٌ	۳۲
۵	تعقیبِ پیغمبریت و رسالت	فرزندِ مسلم بن عویجؓ	۴۰
۶	مفہومِ رسالت و نبوت و امامت	حضرت جبیث	۷۶
۷	مفہومِ محمدیت	حضرت قاسمؓ	۹۲
۸	کردارِ قبلِ نبوت (قبلِ اذیعت)	حضرت علی اصغرؓ	۱۱۰
۹	عرفانِ رسولؐ	حضرت عباسؓ	۱۲۵
۱۰	ضرورتِ رسالت	حضرت علی اکبرؓ	۱۳۲
۱۱	شعورِ کائنات	حالاتِ شبِ عاشور	۱۵۹
۱۲	قریانی آلِ محمدؐ	شامِ غریبیاں	۱۶۳

نام کتاب . . . بارہ مجلسیں

مجموعہ تقاریر . . . علامہ السيد ذیشان حیدر جوادی

عنوان . . . عرفانِ رسالت

\* اشاعتِ اول (پاکستان میں) شمسیہ ۱۹۸۸ء

\* تعدادِ اشاعت . . . ایک ہزار

ناشر . . . احمد بک ڈپو

رضویہ سوسائٹی کراچی ۱۸

کتابت . . . سید حضرت زیدی

ملنے کا پتہ

احمد بک ڈپو رضویہ سوسائٹی کراچی ۱۸

## باسم سجحانہ

اس کتاب میں بارہ مجلسیں آیامِ حرم کی مناسبت سے درج کی گئی ہیں، اور اس امر کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ ان کا مطالعہ کرنے والا سرکارِ دُنیا کی مکمل حیاتِ طینہ پر ایک تظریض اکر لے۔ یہ کتاب نہ اعلیٰ درجہ کے ذاکرینِ کرام کے لیے ہے اور نہ بالسکل مبتدی افراد کے لیے۔

اس میں او سطہ درجہ کے اہل علم کی رعایت کی گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ تدرانہ حقیقیہ بارہ کاہ معصومین علیهم السلام میں قابلِ قبول ہوگا، اور افرادِ قومِ بھی مرکزِ توجہ بنائیں گے۔

جوادی

## (1)

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝  
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ  
الْمُرْسَلِينَ وَخَاتَمِ النَّبِيِّنَ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا أَبِي القَاسِمِ مُحَمَّدِ وَآلِهِ  
الْطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ وَاللُّغْةُ الدَّائِمَةُ عَلَى أَعْدَادِهِمْ إِلَى يَوْمِ  
الْدِينِ أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللَّهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكِتَابِ  
”وَمَا مُحَمَّدُ إِلَّا رَسُولٌ“

اے اہلِ عِزَّا ! عِزَّا کے دن آپ سنچے۔ غم کی راتیں بُکا کے دن آپ سنچے  
آسمانِ حُجَّہ کا چاندِ نمودار ہو چکا ہے۔ یہ چاند پانے ساتھ بیشمار یادیں لیکر آیا ہے  
اس کی ہر یاد ایک خاص تاثر کھتی ہے اور اس کی ہر یاد کے ساتھ انسانی  
زندگی کا ایک سلسلہ والیستہ ہے۔

یہ چاند مختلف منزليں طے کر کے منتظرِ عام پر آیا ہے اور یہ پیغام لایا ہے  
کہ اسی طرح ساتھِ ہمیں فاطرؑ کا چاندِ سفر کی مختلف منزليں طے کر کے  
کر بلکہ افق پر طالع ہوا تھا۔

یہ چاند پانے صعفت و ضھرالاں سے ریخت رُستار ہے کہ جیسی تفاصیلیں  
پچھئیں جائیں چھی تھے جو تکانِ سفر سے اسی طرح ضھرال او رکمزور ہو گئے تھے

یہ چاند اپنی ساخت و وضع سے اس یاد کوتازہ کر رہا ہے کہ کل کربلا کے میدان میں آں رسول کے شمن، ذریتِ پیغمبر کے خون کے پیاسے بھی اسی طرح نیام میں خبیر چھپا کر لائے تھے اور فاطمہ کے لال کا خون بہانا چاہتے تھے۔

یہ چاند بھری سال کا پہلا چاند ہے جو اسلامی تاریخ کے پڑھنے والوں کو اس واقعہ ہجرت کی یاد دلارہا ہے جب خدا کے رسول نے دشمنوں کے مظالم و مصائب سے تنگ آکر حکم خدا اپناوطن چھوڑ کر مدینہ کا رُخ کیا تھا۔ لیکن ازباب عزا! اسلام کی تاریخ کا یہ عجیب المانگنرا درجت فرا واقع ہے کہ سماں سال پہلے نبی اکرم نے اپناوطن چھوڑا تو مدینہ نے بڑھ کر آپ کا استقبال کیا اور اپنی آغوش محبت میں آپ کو جگردی۔ مدینہ آپ کے لیے دارالہجرت ہی نہیں بلکہ دارالامن بھی بنا، اور سماں سال نہیں گزرنے پائے تھے کہ اسی مدینہ نے نبی کے لال کو پناہ دینے سے انکار کر دیا اور حسین کو دین خدا کی خاطر مدینہ چھوڑ دینا پڑا۔

تاریخ عالم میں اس القلب کی مثال نہیں مل سکتی کہ نبی کرم نے کہ چھوڑ کر مدینہ کا رُخ کیا تھا اور حسین نے ۲۸ ربیع کو مدینہ چھوڑ کر کہ کا رُخ کیا۔ کر ملا کے فلسفہ پر نظر کرنے والے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ امت اسلامیہ نے لصفت صدی کے اندر کھتنا بر القلب پیدا کر دیا تھا اور حالات میں کس قدر فرق پیدا ہو گیا تھا کہ نبی کا دارالہجرت حسین کی پناہ گاہ نہ بن سکا۔

حسین ۲۸ ربیع کو مدینہ نہیں چھوڑ رہے تھے، نانا کے کلہ پڑھنے والوں اور اسلامی تاریخ سے بھی پر رکھنے والوں کے ذہنوں کو ان تاریخ حقیقتوں کی

طرف موڑ رہے تھے جن کی طرف توجہ یزیدیوں کے کردار کو پہ نقاپ کرنے میں مکمل مدد سے سکتی ہے، اور یہ بتا سکتی ہے کہ فاطمہ کے لال نے اپنے وطن عزیز کو کیوں چھوڑا اور حسین کو بلا کن حالات میں گئے۔

یزید اور یزیدیت کے پرستار آج بھی یہ پروپگنڈہ کر رہے ہیں کہ یزید نے اسلام میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور اس کا دین بعضیہ پیغمبر کا دین تھا لیکن حسین نے روزاول ہی اس پروپگنڈہ کی قلعی کھول کر رکھ دی اور یہ واضح کر دیا کہ جو انسان نبی کے لال کو اس کے وطن میں خاموش نہ ہیجھنے والے وہ اسلام کو اس کے اصل مرکز پر کھونکر برداشت کر سکتا ہے جب کہ نواسہ رسول خاموش ہے اور اسلام قدم قدم پر یزید کے کردار پر تقدیر کر رہا ہے۔

محترم کے اس چاند کے ساتھ روانے زمین کے گوشے گوشے پر صفت بچھ گئی ہے اور رسولؐ کو ان کے لال کا پرسہ دینے والے مسلمان اور انسانیت کو اس کی قدرتوں کی بربادی پر تعزیت میش کرنے والے انسان سب اس غم میں برا بیر کے شریک ہیں مسلمانوں کے آنسو اس بات پر بہپہ رہے ہیں کہ امت نے اولاد رسولؐ کی قدرت پہچانی حسین کو کر بلایا میلا کر شہید کر دیا اور دنیا کے دوسرا انسان اس بات پر اٹکیا ہی کہ انسانیت کے ڈھنڈوں نے انسانیت کے مرقع کو خاک میں ٹلا دیا، اور حسینؐ سے ملنے والے انسانی درس کا درس سہیت کر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ زیانِ خبر کے خاموش ہو جانے کے بعد آستین کا ہوا

^

پکارنے لگتا ہے اور خونِ شہید کی سُرخی آج بھی ان انسانی تعلیمات کو دُہرائی جائے جن کا راستہ بند کرنے کے لیے یزید نے تیس ہزار سے زائد فوجوں کی دیواریں کھڑی کی تھیں۔

حسین اگر فقط مظلوم ہوتے تو دنیا انسانیت ان کے غم میں ہمروئی کے چند آنسو بہا کر خاموش ہو جاتی، یا دور حاضر کی رسم کی پناہ پر چند لمحوں کی خاموشی میں غمِ حسین کا سسلہ ختم ہو جاتا۔ لیکن حسین کی دُوربیں نگاہوں نے مظلومیت کے ہر خاکہ میں تعلیمات کا ایک رنگ بھرا ہوا ہے۔ مدینہ چھوڑنے سے لیکر سجدہ آخوند حسین کی مظلومیت کے ہر خاکہ میں اسلامی تعلیمات اور انسانی زندگی کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ اس لیے غمِ حسین صرف چند آنسوؤں تک محدود نہیں رہ سکتا بلکہ آنسوؤں کی چھاؤں میں ان اسیاق کو بھی دُہرانا پڑے گا جن کے لیے فرزندِ رسول نے جان قربان کی تھی اور مظلومیت کے خاکہ میں اس رنگ کو بھی دیکھنا پڑے گا جو حسین مظلوم نے اپنے خون کی سُرخی سے بھرا تھا۔

تفصیلی تبصرہ آئندہ تاریخوں میں کیا جائے گا۔ اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ حسین کسی وقتی اور اچانتک ظلم کا شکار نہیں ہوتے تھے حسین اتفاقی طور پر صائب کاشانہ نہیں بنے تھے حسین کی مظلومیت کسی انجامِ حیثیت کا نتیجہ نہیں تھی۔ بلکہ اس اقدام کے لیے ظلم والے بہت دور سے منصوبہ بنارہے تھے اور مظلومیت کا علمیر دار منصبوب کو ناکام بنانے کے لیے اس سے زیادہ دور سے انتظام کر رہا تھا۔ یزید کی نگاہیں اتنی دور رس

ہنیں ہو سکتی تھیں جیتنی دور رس زگا ہیں فرزندِ رسول اللہ تقیین کی تھیں۔ یزیدی یہی سمجھ رہا تھا کہ اچانک بیعت کام طالبہ اور اس کے ساتھ قتل کی دھمکی حسین کے ہوش اڑادے کی اور وہ اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی صحیح فیصلہ نہ کر سکیں گے لیکن حسین اپنی امامت کی نگاہ سے اس پورے مستقبل کا جائزہ نہ رہے تھے جہاں تک یزیدی لگا ہوں کی رسائی نہیں تھی۔ امام حسین نے فیصلہ کیا کہ مجھے ظلم کا مقابلہ مظلومیت سے کرنا ہے لیکن اس اہتمام کے ساتھ کہ مظلومیت کو بیچا رگی اور بے لبی کاتام نہ ملنے پاٹے مجھے مظلومیت میں اسلامی تعلیمات اور انسانی زندگی کا وہ رنگ بھردیتا ہے جو میرے ساتھ میرے مقصد کو ادا مقصد کے ساتھ میری یاد کو صحیح قیامت تک زندہ رکھ سکے۔ آج حسین بھی زندہ ہیں اور حسین کا مقصد بھی زندہ ہے۔ یزید کیا اور اس کا مقصد بھی فتا ہو گیا۔ اہل نظر اس حیرت میں پڑے ہوئے ہیں کہ حسین نے اپنے مقصد کو زندہ رکھا۔ یا مقصد کی بلندی نے حسین کو زندہ رکھا۔

یزید نے اپنے مقصد کو مٹایا یا مقصد کی گندگی نے یزید کو فنا کر دیا۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ مقصد کو شخصیت کی فنا دلیقا سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور اس روشنی میں یہ کہنا آسان ہے کہ فرد میں خلوص اور مقصد میں بلندی ہوتی ہے تو فرد مقصد کی حفاظت کرتا ہے اور مقصد فرد کی نگہداشت میں ہ صروف رہتا ہے۔

حسین آج ساری دنیا کے انسانیت کے جانے پہچانے رہتا ہیں اس کا راز یہی ہے کہ دنیا کے ایک طبقہ نے حسین کو ان کے مقصد سے پہچانا ہے،

تودہ سرے طبق نہ حیث کے مقصد کو ان کی شخصیت و منظومیت سے اور یہ حسینی انداز نظر کا امتیاز ہے کہ دنیا ذات کو بات اور شخصیت کو قصد سے جُدا نہیں کر سکی اور نہ کر سکتی ہے۔

شخصیت اور مقصد کا یہی اتحاد تھا جس کی طرف قرآن حکیم نے ان لفظوں میں اشارہ کیا تھا۔ ”وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ“ • محمد صرف اللہ کے رسول ہیں۔ ان کی شخصیت کا کوئی رُخ اور ان کی ذات کا کوئی پہلو رسالت سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ وہ زندہ ہیں تو رسول ہیں و انشال کر جائیں یا شہید ہو جائیں تو بھی رسول ہی رہیں گے۔ اور یہی وصیت ہے کہ آج مرسل اعظم کو دیا چھوڑے ہوئے چودہ سورس کے قریب ہو گئے ہیں لیکن ہر گلدارستہ اذان سے ایک یہی آواز آرہی ہے اشہدُ آنَّ مُحَمَّدَ رَسُولُ اللّٰہِ — ہم گواہی دیتے ہیں کہ محمد آج بھی اللہ کے رسول ہیں۔

مقصد شخصیت کا جزو نہیں یہ تا لوگھی مقصد شخصیت سے پہلے فنا ہو جاتا ہے اور بھی شخصیت مقصد سے پہلے ہے — لیکن جب دونوں ایک دوسرے کے جزو بن جاتے ہیں تو اس اتحاد ہو جاتا ہے کہ کل کہ کا جزو لفظاً محمد بھی رہتا ہے اور لفظ رسول اللہ بھی ۔ اب نہ محمد کا انکار ممکن ہے اور نہ رسالت کا۔ محمد رسالت کے ذمہ دار کا نام ہے اور رسالت محمدؐ کے طریقہ کار کا — صلوٰات سرشن طاقتیں ہمیشہ اس بات کی کوپشش کرتی ہیں کہ شخصیت کو

مقصد سے الگ کر دیا جائے تاکہ مقصد کو اپنے سانچے میں ڈھالا جاسکے لیکن خالقِ کائنات نے قرآن حکیم کو قلب سعیر پر اُتار کر کفر کو مایوس کر دیا، اور مسلم عظیم نے وقت آخر قرآن والی بیت کے اتحاد کا اعلان کر کے نفاق کو مایوس کر دیا۔ اب زندگی کے کسی موڑ پر بھی مقصد کو شخصیت سے الگ نہیں کیا جا سکتا کہ دارِ آلِ محمد لینا ہے تو قرآن کے دامن سے حاصل کرو اور قرآن لیتا ہے تو اُلِ محمد کی ڈیوٹی بھی پر آؤ۔

شخصیت اور مقصد کے اتصال و انفصال کی متقابل کوشش کا تام ہے کربلا۔ یزید کا مقصد تھا کہ نبی ہاشم کو بینام کر کے اسلام کو ان کے گھرانے سے زکال لے اور پھر اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال دے اور فرزند رسولؐ کی آواز تھی کہ اگر دین خدا میں استحکام میرے قتل کا محتجاج ہے تو جان دے سکتا ہوں، لیکن اسلام کو کردارِ سعیر پر سے الگ کر کے کردار یزید کا نام نہیں دے سکتا۔ یہ سیاست کا مجھہ تھا کہ حسینؑ نے یزید کو ایک ایسے موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا جہاں یزید، امام حسینؑ سے اپنی بیعت کے بغیر اپنے مشن کو نامکمل سمجھتا ہے اور اپنی حکومت کو اسلامی رنگ دینے کے لیے ساری کائنات میں صرف حسینؑ سے بیعت کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا شہوت ہے کہ حسینؑ کی ذات اسلام سے اس قد متحد ہے کہ حسینؑ کی تصدیق کے بغیر کوئی حکومت اسلامی نہیں کہی جا سکتی۔ کاش یہی بیات دنیا کے دوسرے مسلمان بھی محسوس کر لیتے اور اخھیں اندازہ ہو جاتا کہ جس حکومت کو حسینؑ کے گھروں نے ٹھوکر مار دی ہے وہ حکومت اسلامی نہیں ہو سکتی۔ اسلام حسینؑ

کے گھر کا پرو رہ ہے اور حسین کا گھر انہوں نے ترجیحی تر جان و تحریک کے لئے۔

”اسلام ہی کا اسمِ گرامی حسین ہے“

۲۸ ربج کی رات تھی جب نیزیدیت نے اپنی مہم کا پہلا قدم اٹھایا اور نیزید کے گورنمنٹ امام حسین کو راول رات دربار میں طلب کر لیا۔ این نیزید جیسے کمزور نفس افراد نے راہ فراز اختیار کی تھیں حسین علیؑ کے لال حسین — فاتح خبر کے فرزند حسین — فاتح دربارِ ظلم کے فوراً نظر حسین نے یہ طے کر دیا کہ مجھے دربار میں جانلے اور ولید سے باقاعدہ فیصلہ کن گفتگو کرنا ہے۔ یہ عزم کر کے بیت الشرف میں تشریف لائے۔ بہن کو پیغام سنایا۔ بہن نے ارادہ دریافت کیا۔ امام حسین نے فرمایا۔ ”بہن میں دربارِ ولید میں جا رہا ہوں، دیکھوں اس کا مقصد کیا ہے۔

بہن کا دل تسلیپ گھا عرض کی۔ ماں جائے! میں آپ کو کیلئے نہ جانے دوں گی۔ اگر جانا ہی ہے تو اپنے ساتھ میرے شیر عباش کو لے جائیے، میرے لال اکبر کو لے جائیے، ہاشمی جوانوں کو لے جائیے تاکہ زینت کے دل کو اطمینان رہے کہ میرا بھیا اکیلا نہیں ہے۔ اس کی پشت پر میرے شیر و ول کی ایک فوج ہے۔ جاں بشاروں اور غلاموں کا ایک لشکر ہے۔

یہ کہکشاں جوانوں کو طلب کیا، اور سب کو تیار کر کے بھائی کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اور فرمایا، میرے ہاشمی جوانو! میرے دل کے ٹکڑو! یہ خیال رکھنا کہ میرا مانجا یا پہنچ پہلی مجھ سے جُدا ہو کر جا رہا ہے۔ دیکھو! میرے بھیا پر کوئی آنکھ نہ آنے پاتے۔

میں نہیں جانتا کہ زینبؓ نے بنی ہاشم کے جوانوں سے کیا کہا۔  
تاریخ کے اوراق بھی خاموش ہیں لیکن میراول کہتا ہے کہ زینبؓ کے جذباتان  
تمام ہدایات کی طرف متوجہ کر رہے ہوں گے جو ایک بہن اپنے بھائی کی حفاظت  
کر سکتی ہے۔

امام حسینؑ دربار کی طرف چلے۔ زینبؓ کا لشکر ساتھ ساتھ چلا۔ دربار تک  
پہنچے۔ بلاشی جوانوں کو دروازہ پر رکا۔ خود دربار میں داخل ہونے۔  
ولید نے احترام سے بٹھایا۔ مگر معاویہ کی خبر سننائی۔ حسینؑ نے اسلامی  
تعلمات پر عمل کرتے ہوئے کلمہ انا نبِ اللہ زیان پر جاری کیا۔

بنی امية کے نمک خواروں کا بیان ہے کہ امام حسینؑ نے اس موقع پر  
حاکم شام کے لیے دعائے رحم و کرم بھی کی، لیکن یہ بات انتہائی نامعقول  
اور ناممکن ہے کلمہ انا نبِ اللہ اسلامی تعلیم اور بلاشی اخلاق بے لیکن ظالم  
یاد شاہ کے لیے دعائے رحم و کرم کرنا کسی اسلام کی تعلیم نہیں ہے۔ بھلا حسینؑ  
اس کے لیے کیا دعائے رحم و کرم کریں گے جس کی سازش نے انھیں یہم بتایا  
ہے جس کے زیر ہن اُن کے بھائی کے جگر کے بہتر نکلو کے کیسے ہیں اور جس  
کے نہ لئے ہوئے حاکم نے آج بیعت کا مرطابہ کیا ہے۔ (الْعِيَادُ بِاللّٰهِ)  
خبر وفات کے ساتھ ولید نے یزید کا پیغام سُتایا۔ حسینؑ آپ کو  
بیعت کرنا ہو گی۔

آپ نے فرمایا، یہ اہم سائل پر دہشت کی تاریخی میں نہیں طے ہوتے  
کل دربار میں مجھے بلانا میں اُس وقت لگتلو کر کے یہ واضح کروں گا کہ بیعت

کا حقیقی حقدار کون ہے اور بیعت کسے کرنا چاہیے۔  
 امام حسین علیہ السلام کی منطقی گفتگو نے ولید کو مطمئن کر دیا اور اُس نے  
 آپ کو خصت کر دیا، لیکن مردوں ان بول ڈرا  
 ولید! اگر آج حسینؑ کو نکل گئے تو پھر ہاتھ نہیں آئیں گے۔ بہتر ہے  
 کہ ان سے بیعت لے لے، یا ان کا قسلم کر لے۔  
 یہ سنتنا تھا کہ فاتحِ خیبر کے لال کو حلال آگیا، اور فرمایا: اوزنِ نیلوں حشیم  
 کے پچھے۔ ا تو مجھے قتل سے ڈرارہا ہے؟ کس کی مجال ہے جو میری طرف نظر  
 اٹھا کر دیجھے کے۔

امام کی آواز کا بلت میونا تھا کہ ہاشمی جوان دربار میں داخل ہو گئے۔ آگے  
 آکے تلوادیے ہوتے قمرتی ہاٹم۔ چہرہ غصہ سے مُرخ نیوریاں چڑھی ہوئی  
 ہی در کردار عکا جلال نمایاں۔ خبردار! ولید، اب مولا کی شان میں کوئی  
 گستاخی نہ ہونے پائے۔

ولید بدھواس ہو گیا۔ فرزندِ رسولؐ نے بھائی کو روک دیا۔  
 بس بھیسا عباس! میسرے بھائی یہ وقتِ جہاد نہیں ہے۔  
 مولا کا حکم ملا، عباسؓ نے تلوار نیام میں رکھی اور ہاشمی جوانوں کے حلقے  
 میں مولا کو لے کر بیت الشرف تک آئے۔

جیسے ہی شانی زمہر نے بھائی کو دیکھا، دور کرمانجاۓ سے پیٹ گئیں  
 ارسے میرے بھیا آپ واپس آگئے۔  
 زینبؓ کو سخت اضطراب تھا، دیکھیں، کیا گذر تھے۔ اماں کی یا لگکار!

آپ واپس آگئے؟  
تو زینب کا دل ٹھہر گیا۔ کیوں نہ ہو۔ میرا عباس ساتھ تھا، میرے  
باشمی جوان ہمراہ تھے۔

عز ادارانِ حسین! جی چاہتا ہے عرض کروں۔ شہزادی! آج جب  
بھائی دربار کیلئے گئے تو آپ نے ایک پورا باشمی لشکر ساتھ کر دیا۔

لیکن کل جب عصرِ عاشورہ آپ کامانجا یا تقلیل میں جائے گا تو کیا کیجئے گا؟  
کون ساتھ جائے گا۔ کون رکاب تھامے گا۔ گون گھوڑے پر سوار کرے گا؟ اُس  
وقت نہ قائم ہونے گے، نہ عون و محمد، نہ علی اکبر ہوں گے، نہ عباس۔

عجب نہیں شہزادی جواب دیں۔ جب کوئی نہ ہو گا تو زینب اپنے بھائی  
کو خصت کرے گی۔ زینب بحر گیری کیلئے میدان میں جائے گی، زینب آزاد گی  
اوپر سعد میرا مانجا یا ذبح ہو رہا ہے اور تو گھر اور بھر رہا ہے۔

عز زیر و جوز زینب نے دل میں طے کیا تھا دہی کیا جس میں اکیدے خصت  
ہوتے لگے تو دخیلہ پر اک برآ و تھام کر گھوڑے پر سوار کیا اور جب گھوڑے سے گرسے تو گھبرا کر  
میدان میں آگئیں اور وہ منتظر دیکھا جو خدا کسی بین کو نہ دکھلاتے۔ ہائے وہ حسین کا مسجدہ  
آخر، وہ شمر کا خنجہ اور وہ زینب کی فریاد۔

حسین نے اشارہ کیا۔ زینب خیہ کی طرف لوٹیں، زمین کر بلاہی، فضائل  
آواز کو سمجھی۔ الْأَقْتَلُ الْحُسَيْنُ يُكْسَبْلَا ، الْأَدْبُرُ يُحْمَلُ الْحُسَيْنُ يُكْسَبْلَا  
إِنَّا بِهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

۲

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ  
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى  
اَشْرَفِ الْأَوَّلِينَ وَالآخِرِينَ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا اِلٰمِ الْعَالَمِ  
مُحَمَّدٌ وَالٰهُ الطَّيِّبُينَ الطَّاهِرُينَ وَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰى  
اَهْدَى آتِيهِمْ اِلٰى يَوْمِ الدِّينِ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى  
فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلٰرَسُولٌ" -

قرآن حکیم نے حضور سرور کائنات کا تعارف ان مختصر الفاظ میں کیا  
ہے کہ "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلٰرَسُولٌ"، محمد کوچھ نہیں ہیں یہ صرف  
اللہ کے رسول ہیں۔ ان کی رسالت بھی کوئی نئی چیز نہیں ہے، جسے تم نہ سمجھ  
سکتے ہو۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں تھیں رسالت کے  
معنی بھی معلوم ہیں، تم رسول کی حیثیت اور عظمت سے بھی باخبر ہو۔ اور  
تمھیں ان قوموں کے حالات بھی معلوم ہیں جنہوں نے اپنے دور کے رسولوں  
کا انکار کیا اور دنیا و آخرت کا خسارہ اٹھایا۔

انسان جب دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اپنے ہمراہ میثما رہا دی اور

دنیا وی تعلقات بیکر آتا ہے۔ یہ تعلقات کبھی رشتہوں کی شکل میں سامنے آتے ہیں اور کبھی دوسرے عنوان سے دکھانی دیتے ہیں۔  
آئے دالا بچہ ایک ماں باپ کا بیٹا ہوتا ہے تو ایک ہیں یا بھائی کا بھائی  
ایک دادا کا پوتا ہے تو ایک نانا کا نواسہ ایک چیبا کا بھتیجا ہوتا ہے تو ایک  
ماموں کا بھانجہ۔

خون کے ان رشتہوں کے علاوہ کچھ اور تعلقات بھی ہوتے ہیں کہ وہ  
ایک ملک کا باشندہ ہوتا ہے تو ایک زبان کا خواجہ۔ ایک قوم کی فوج  
ہوتا ہے تو ایک قبیلہ کا رکن۔ ایک وطن کا رہنے والا ہوتا ہے تو ایک جماعت  
کا ممبر۔ اس کے بعد جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے زندگی کی ضروریات  
میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ حیات مختلف ترقی کی منزلوں سے گزرنے لگتی  
ہے۔ اور ہر منزل کے ساتھ ایک نئے رشتے کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ کبھی  
وہ استاد کا شاگرد بنتا ہے کبھی شاگرد کا استاد۔ کبھی دفتر کا ملازم بنتا ہے  
کبھی ملازموں کا حاکم کبھی زوجہ کا شوہر ہوتا ہے کبھی بچوں کا باپ۔ غرض زندگی  
کے ہر موڑ پر ایک نئے رشتے کا اضافہ ہوتا ہے اور حیات چند روزہ کا ہر  
لحہ ایک نئی ذمہ داری لے کر آتا ہے۔

زندگی کے ان ہی اعتبارات کے ساتھ اس کے نام اور عنوان بھی  
بدلتے جاتے ہیں۔ وہ ایک نام قوم کے اعتبار سے پاتا ہے تو ایک ملک کے  
اعتبار سے۔ ایک عنوان وطن سے حاصل کرتا ہے تو ایک قبیلہ سے۔ لیکن .....  
مادتیت کے یہ رشتے اس وقت مضمحل اور کمزور ہونے لگتے ہیں جب انسان

روحانی ترقیوں کی منزلوں میں قدم رکھتا ہے۔ وہ قوم اور قبیلہ کا فرد اسکے وقت تک شمار ہوتا ہے جب تک اس کی عوامی حیثیت نہیں ہوتی عوامی حیثیت حاصل کر لینے کے بعد وہ سارے عنوان خود بخوبی بدلتے ہیں۔ انسان ابتدائی زندگی میں ایک گھرانہ اور خاندان کی ملکیت ہوتا ہے اور درجہ کمال پر فائز ہونے کے بعد پوری قوم کی ملکیت بن جاتا ہے گھر میں جلنے والی روشنی گھر والوں کی ملکیت ہے لیکن آفتاب عالمتاب پوری دنیا کے لیے ہے جو ضمیں جمع ہونے والا پانی ایک گھر کی ملکیت ہے لیکن یہ ملکیت پرسی کی اجارہ داری نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اصولِ نظرت نے ہی انسان کو یہ سکھا دیا ہے کہ محدود شخصیت محدود افراد کے لیے ہوا کرتی ہے اور شخصیت کا پھیلاوا اس کی ہر گیری کا سبب بن جاتا ہے۔

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ طبی حیثیت پیدا کرنے کے بعد انسان کے ابتدائی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ تو غیر ممکن ہے انسان قوم و قبیلہ وطن زبان کے شکنچوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ شکنچے اس کے پھیلی ہوئی شخصیت کو اپنے گھیکر میں لینے سے قاصر ہے جاتے ہیں۔ آپ نے برادر تحریر کیا ہو گا کہ ابتدائی منزلوں میں رونکنے کے لائق ہوتا ہے لیکن سیلا ب بن جانے کے بعد کسی گھیر اور (رُکاوٹ) کو قبول نہیں کرتا۔ یہی حیثیت عالمی شخصیتوں کی ہوا کرتی ہے کہ وہ اپنے کمالات کی بناء پر ان منزلوں پر پہنچ جاتے ہیں، جہاں چھوٹے بندھوں کا گذرنہیں ہوتا، اور شخصیت کے

ہے گیری ان بندھوں کو تحت الشّاعر میں ڈال دیتی ہے۔  
 ایک سیاہی رنگ کسی وطن و خاندان کی ملکیت نہیں ہے۔ وہ ایک  
 پوری قوم کی مسار یہ بہلے ہے۔ ایک ڈاکٹر کسی قبیلے نسل کی جاگیر نہیں  
 ہے بلکہ پوری قوم کا سرمایہ ہے۔ ایک عالم دین کسی رنگ و نسب کا پابند  
 نہیں ہے بلکہ پوری دنیا کے مذہب کا سرمایہ افتخار ہے۔

شخصیت کا چھیلا او اس کے ابتدائی رشتہوں کو مکروہ اور اس کے ماڈی  
 تعلقات کو ناقابلِ توجہ بنا دیا کرتا ہے۔ مثلاً سید الشہداء امام حسن علیہ السلام  
 کی شخصیت کی ہمہ گیری اور آفاقیت کا راز بھی یہی ہے کہ حسین کمالات کی ان  
 منزلوں پر ہیں جہاں قوم و ملت رنگ و نسل، قبیلہ و خاندان کے شکنخوں کی  
 رسائی نہیں ہے۔ حسین کی عظمت تک خود دنیا کے انسانیت کی بھی رسائی  
 نہیں ہے۔

یہ سوچنا غلط ہے کہ حسین کو ساری دنیا کے انسانیت کا شہید بنا دیا  
 جائے تو ان کی عظمت کو چار چاند لگ جائیں گے اور وہ ملک و ملت، قبیلہ  
 و قوم کے شکنخوں سے آزاد ہو کر بین الاقوامی شخصیت بن جائیں گے۔ ان کی  
 شان یہ ہو گی کہ صرف ایک قوم نہیں بلکہ "ہر قوم پکارے گی ہمارے ہی حسین"۔  
 یہ صور عظمت حسین کے نہ پہچانتے ہی سے پیدا ہوا ہے حسین کی ذات  
 جس طرح قوم و ملت میں اسی نہیں کی جا سکتی اسی طرح ان کی عظمت کردار کو  
 انسانیت کے محمد و رسول صورات کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ حسین اس یمندی  
 پر ہیں جہاں انسانیت تو انسانیت کل کائنات کی رسائی نہیں ہے۔

دنیا نے حسینؑ کے رشتے کو انسانیت سے جوڑا ہے اور خود حسینؑ نے  
اپنے رشتے کو خدا سے جوڑا ہے۔ انسانیت ایک محدود تصور ہے اور خدا  
ایک لا محدود تصور ہے۔ محدود سے رشتہ مشخصیت کو محدود دینا دیتا ہے، اور  
لامحدود سے لائق عظمت و بلندی کی حد بندیوں کو توڑ کر مشخصیت کو ابتدئی اور  
سرمدی بنا دیا کرتا ہے۔

دنیا نے امام حسین علیہ السلام کی اس عظمت کو پہچان لیا ہے تو قرآن مجید  
کے اس فقرے کا بھنا بہت آسان ہے جسے میں نے عنوان کلام قرار دیا ہے  
اور مرسل عظم کی اس جذیت کا اندازہ آسان ہے جسے میں آپ کے سامنے  
پیش کرنا چاہتا ہوں۔

حسینؑ اپنے ننانکی عظمت کا امینہ ہیں حسینؑ کو دار پیغمبرؐ کی تصویر میں  
حسینؑ بلندی رسالت کے سمجھنے کا پہیا نہ ہیں جس نے حسینؑ کو نہیں پہچانا وہ  
پیغمبرؐ کو صحی نہیں پہچان سکا۔

قرآن حکیم نے مرسل عظمؐ کی اسی عظمت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ  
میرا صبیب اپنے وجود ظاہری کے ساتھ بیشمار رشتے لیکر آیا ہے اس کے  
ساتھ قوم کا رشتہ بھی ہے اور خاندان کا بھی۔ یہ زبان کا رشتہ بھی رکھتا  
ہے اور وطن کا بھی۔ اسے منگی کہنا بھی درست ہے اور مدغی بھی۔ یہ عربی بھی  
ہے اور بہائمی بھی۔ لیکن اپنے کمالات کی بناء پر عظمت و جلالت کی اس  
منزل پر ہے جہاں ان معمولی رشتوں کی رسائی نہیں ہے۔ اسے رشتتوں میں  
حمد و ذکر نہ اس کی عظمت کی توہین ہے۔ اسے پہچانتا ہو تو لوگوں پہچانا لو۔۔۔

وَهَمَّ حَمْدٌ لِلَّا رَسُولٌ، " (محمد صرف اللہ کا رسول ہے) اس کا رشتہ خدا سے اتنا گھر اور حکم ہے کہ یا تو رشته ماند پڑ گئے ہیں اور ان کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی ہے۔ اس کی معرفت یہ نہیں ہے کہ اسے ملکہ، مدینہ عرب اور ماشیت سے پہچانو۔ اس کی صحیح حیثیت یہ ہے کہ اسے خدا کے ذریعہ اور خدا کو اس کے ذریعہ پہچانو۔ اسی لیے قرآن حکیم نے واضح تک روی تھی کہ میرے حبیب! آپ یوں کہیے کہ میری مناز میری عبادتیں میری زندگی اور میری موت سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔"

میں قوم و ملت کی خدمت بھی خدا ہی کے لیے کرتا ہوں اور قبید و خاندان سے اُنس والفت بھی اُسی کے لیے رکھتا ہوں۔ وہ کسی کو اپنا بنا لیتا ہے۔ میں الہیت میں شامل کر لیتا ہوں۔ وہ کسی پر غضبناک ہو جاتا ہے تو میں بھری محفل سے اٹھا دیتا ہوں۔

تا واقف ہیں وہ افراد جو صحیحے ملک و مدینہ سے پہچانتا چاہتے ہیں اور ناہل ہیں وہ انسان جوز لف و رخسار کو میری عظمت کا پیمانہ سمجھتے ہیں میری عظمت کا صرف ایک پیمانہ ہے اور اس کا نام ہے رسالت۔ میں قوم و ملت کا ہو جاتا تو دنیا کے شکنخوں میں گرفتار ہو کر رہ جاتا۔ میں نے اپنے کو وطن و خاندان کے لیے وقف کرو یا ہوتا تو اس کے ساتھ فنا ہو جاتا۔ میں نے اپنی زندگی کو مالک کی بندگی کے لیے وقف کر دیا ہے میری ہستی صرف دوست العالمین کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح

دنیا کا کوئی شکنخ گرفتار نہیں کر سکتا۔ محمد و دیت کی کوئی زنجیر میری شخصیت کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکتی اور انسانیت کی کوئی کم نہ میری بلندی تک نہیں پہونچ سکتی۔

میسری منزل معراج کی رات معلوم ہوئی ہے جب ساری کائنات میرے زیر قدم تھی اور عرشِ عظم میری حجتوں کے نیچے آگیا تھا۔ اُس دن دنیا کو معلوم ہوا کہ دنیا والوں کی رسائی کہاں تک ہے اور اللہ والوں کی عظمت کی انتہا کہاں تک ہے۔

یہ معراج کی رات کوئی ممکنی، ممکنی نہیں جا رہا تھا۔ یہ عرش کی بلندیاں کسی عربی یا ایشی کے زیر قدم نہیں تھیں۔ یہ سماوات عبد اللہ کے فرزند اور عبد المطلب کے پوتے کے قدم نہیں چوم رہے تھے۔ یہ ملائکہ آسمان، قاسم و طاہر کے بیپ کا استقبال نہیں کر رہے تھے۔ یہ عبدیت کی معراج تھی جہاں عبد جانے والا تھا اور مبعودتے جانے والا۔ بندگی سجدہ گہ کی تلاش میں تھی اور الوہیت مسجدِ اقصیٰ کی نشاندہی کر رہی تھی۔

دنیا پہچان سکے تو پہچانے کے عظمت کا معیار قوم و قبیلہ نہیں ہے عظمت کا معیار تو عبودیت اور بندگی ہے۔ معراج کے تذکروں پر سر دھنے والے سمجھے سکیں تو سمجھیں کہ قابِ قوسمین تک محمدیت نہیں کی تھی، بلکہ عبدیت نے سیر کی تھی۔ اب عظمتِ رسولؐ کا اندازہ کرنالے تو محمدیت کے رشتؤں کو نظر میں نہیں لانا ہوگا، بلکہ عبدیت اور رسالت کے رشتؤں پر غور

کرنا ہوگا۔

ممکن ہے کوئی انسان یہ سوچے کہ معراج میں تو عبدیت کا ذکر ہے رسالت سے کیا واسطہ، رسالت اور ہے اور عبدیت اور۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ رسالت کی عظمت کیا ہے۔ عبدیت سے اس کا کیا تعلق ہے لیکن میں پہلے تو یہ عرض کروں گا کہ رسالت عبدیت ہی کے عظیم درجہ کا نام ہے۔ عبدیت جتنی بڑھتی جائے گی رسالت کے مراتب میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ کیا آپ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی لفظیں نہیں سنیں:

”إِنَّ عَبْدَ اللَّهِ اَشَدِ الْكُثُبِ وَجَعَلَهُ  
نَبِيًّاً“

(سورہ مریم آیت ۲۰)

(میں اشہد کا بندہ ہوں اُس نے مجھے کتاب دیا ہے اور نبی بنایا ہے) لیکن عیسیٰ نے عبدیت ہی کو نبوت کی تمہید بنایا ہے۔ عیسیٰ کی عبدیت انھیں نبوت تک رکھتی اور مرسل عظیم کی عبدیت نے ان کے فرقِ اقدس پر ختم نبوت کا تاج رکھ دیا۔

اس کے علاوہ ایک نکتہ یہ بھی ہے..... کہ معراج میں عبدیت اور رسالت دونوں کا ذکر ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عبدیت جانے میں کام آئی ہے اور رسالت آنے میں کام آئی ہے۔

عبدیت نے اپنی روحانی اور معنوی ترقی کی پناہ پر قاب قوسین تک پہونچایا اور رسالت نے وہاں بھی ذمہ داریوں کا حامل بنایا۔ عبدیت کے ذکرے کے بعد معراج کے مقصد پر روشی ڈالتے ہوئے مالکِ کائنات

نے اعلان کیا۔

وَ لِتُرْبِيَهُ مِنْ أَيْتَنَا طٌ ” (بُنْيٰ اسْرَئِيلٰ آیت ۱)

(اس معراج کا مقصد یہ ہے کہ ہم پسندے بندے کو اپنی نشانیاں دکھلانا چاہتے ہیں۔)

خدای ہی جانے کہ اُس نے کیا نشانیاں دکھلائیں اور صاحب معراج ہی جلنے کے اُس نے کیا دیکھا۔ بال قرآن میں ایک فقرہ حجفظہ رہ گیا وَ أَوْحَى إِلَى عَبْدِهِ قَاتَأَوْحَى طٌ (دال بخم آیت ۱۰) (اُس نے جو کچھ چالا پسندے کو (وحی کے ذریعہ) اشاروں یہ اشاروں میں سمجھا دیا۔)

تاریخ اس صیغہ راز کی تلاش میں تھی۔ ایک مرتبہ غدیر خم کے میدان نے آواز دی۔ ”اے میرے رسول! اسے پہنچا دو جو تمہاری طرف نازل کیا جا چکا ہے۔“

نبی نے قافیہ کو روک کر علیؑ کی ولایت کا اعلان کیا اور شبِ معراج نے آواز دی۔ ”ومعراج کا پرہ اٹھ گیا اور کل جو بات صیغہ راز میں تھی آج عالم میں آشت کار ہو گئی۔“

اعلانِ غدریں ”یَا أَيُّهَا الرَّسُولُ“ کا لفظ گواہ ہے کہ معراج کی رات عبدت، رسالت کا مخصوص پیغام لینے کے لیے قابِ قوسین کی منزلوں تک گئی تھی عبدت اپنا کام کر رہی تھی اور رسالت اپنے فرائض کا استطوار کر رہی تھی۔

عبدیت کا یہی وہ ارتقاء ہے اور ”دَنَا فَتَدَلَّى“ کا  
یہی وہ مزاج ہے جس نے فرزند رسولؐ کو مراج شہادت تک پہونچنے  
کے لیے آمادہ کیا۔ اور حسین نے ایک سجدہ آخری کے لیے یہ اعتمام کیا  
کہ نانا کا دلن چھوڑ دیا۔ اللہ کے حرم سے جدائی برداشت کر لی اور کربلا  
کے میدان تک آگئے۔

نبیؐ کا سفر مراج رالوں رات ہوا تھا اور حسینؐ نے اپنا سفر دن  
دباؤ سے شروع کیا۔ رات کی تاریخی میں نانا کے روپ نے سے رخصت  
ہوتے ہوئے، نادی کی لحد کو الوداع کیا۔ بھائی کی قبر کو آخری سلام کیا اور صبح  
ہوتے ہوئے سارے خاندان کو آمادہ سفر کر لیا۔ جو باقی رہ گئے انھیں  
رخصت کرنے کا اہتمام کیا۔ سب سے پہلے اپنی نانی اُم سلمہ کی خدمت  
میں آئے۔ نانی اماں! پانے حسینؐ کا سلام لیجئے۔

جناب اُم سلمہ نے ترپ کرو چکا، میرے لال ارادہ کیا ہے؟  
کہا، نانی، عراق جا رہا ہوں۔

عراق کا نام سُننا تھا کہ اُم سلمہ کا دل دل گیا۔ بیٹا! عراق  
— عراق — میرے حسینؐ! یہ عراق کا نام کیوں لیا۔ عراق کا ارادہ کیوں  
کر لیا؟ عراق والوں نے تمہارے بیپ اور بھائی کے ساتھ وفا  
نہیں کی۔ اب تم کیوں عراق جا رہے ہو؟ حسینؐ! پہلے پہنچانا  
سے تو رخصت لے لو۔

آواز آئی نانی اماں! یہ حکم میرے نانا ہی نے دیا ہے۔ نانے

فرمایا ہے حسین ! کربلا جاؤ - میرے لال ! سرکشاو، اور میرے دین کو  
بچاؤ۔ اُم سلمہ کیجھ پکڑ کر بینچھتیں۔

ارے میرے لال ! کوئی یوں بھی اپنے مرنے کی خبر نہ تاتا ہے -  
بیٹا ! تو مجھے کیوں رُلوار ہے، میرے لال - یہ بتاؤ کہ تمہاری خبر کیسے ملے  
گی، تمہارے سفر کے حالات کیسے معلوم ہوں گے ؟

امام حسین نے کہا، نافی آماں، میں آپ کو ایک جگہ دکھلانا چاہتا ہوں  
نافی آماں نے یہ صد اشتیاق استھیں کھوئیں - نواسے نے اشارہ کیا۔  
عالم کی زمینیں پست ہوئیں کربلا کی زمین ملنے ہوئی۔

حسین نے اشارہ کیا - نافی جان ! آپ اس لشیب کو دیکھ رہی  
ہیں - ؟

امم سلمہ نے غور سے دیکھا، حسین نے کہا، نافی آماں ! یہی وہ جگہ  
ہے جہاں آپ کے حسین کا گلا کا طاحا جائے گا۔ یہیں آپ کا لال شہید ہو گا۔  
یہیں پختگی کی آخری تصویر خاک میں ملائی جائے گی۔ یہیں فاطمہ کا باعث  
اُجڑے گا اور نبی کا گاستان خداں کی نذر پہوچائے گا۔

امم سلمہ نے آنسوؤں کو روک کر غور سے اپنے لال کے مقتل کو  
دیکھا۔ دل نے ترطیب کر آواز دی۔ اُم سلمہ بدیکھ لو، اب حسین پھر نہ  
ملیں گے۔ اب یہ تصویر ہپر نہ دیکھنے میں آئے گی۔ اب یہ حسین چھسے  
پلٹ کر دے آئے گا۔

نافی نے جی بھر کر نواسے کو دیکھا۔ دل کو سنبھال کر لوچھا، بیٹا ! یہ بتاؤ

یہ واقعہ کب پیش آئے گا اور مجھے اس واقعے کی خبر کیوں کہ ہوگی ؟  
 امام حسین نے ہاتھ بڑھا کر ایک متھی خاک کر بلاؤٹھائی اور جناب  
 اُم سلمہ کے حوالے کر دی۔ نانی آماں ! آپ اس خاک پر نظر کھیں جب  
 تک یہ خاک رہے، مجھیں کہ آپ کا حسین زندہ ہے اور حبیب خاک  
 خون میں تبدیل ہو جائے، مجھیں آپ کا حسین مارا گیا۔  
 حسین مدینہ چھوڑ کر رخصت ہو گئے، مکہ آئے، اور مکہ سے رخصت  
 ہو کر کر بلاؤٹھائے۔

ادھر جناب اُم سلمہ کا دستوریہ ہے کہ جب دل گھبراتا ہے اور حسین  
 کی یاد طریقی ہے تو گھبرا کر اس شیشے کو دیکھ لیتی ہیں۔ خاک کو بشکلِ خاک پاک  
 دل بھی دل میں دعا دیتی ہیں۔ ”اللہ ! میرے حسین کو سلامت رکھے۔  
 اللہ ! میرے لاال کو دشمنوں سے بچائے۔ میرے مالک ! تیرا شکر ہے  
 ابھی فاطمہ کا لاال زندہ ہے۔ ابھی میرا حسین بخیریت ہے۔

وقت گذرتا رہا، حالات بدلتے رہے۔ محترم کا چاندنیک پر  
 عنودار ہوا، اب اُم سلمہ کا دل برا برداشت کرنے لگا۔ ادھر حسین کے بچوں پر  
 پانی بیند ہوا؛ ادھر اُم سلمہ کا دل طریقہ۔ ادھر حسین زغمہ اعداء میں گھرے ادھر  
 اُم سلمہ کے اضطراب میں اضافہ ہوا۔ ادھر حسین عاشور سے قریب تر ہوتے  
 رہے ادھر اُم سلمہ کی الحسینیں بڑھتی رہیں اور حبیب الحسینیں پیدا ہوں، دوڑ کر  
 جائیں اور شیشی کو دیکھ لیں۔ دل ٹھہر جائے۔  
 یہاں تک کہ عاشور محترم کا دن آیا۔ آج اُم سلمہ کو صبح سے قرار نہیں۔

باریار شیشی کو دیکھتی ہیں اور حسین کی سلامتی کی دعا میں کرتی ہیں۔ ایک مرتبہ ظہر کے بعد احمد مسلم لبتر پر پیٹ گئیں، شدتِ اضطراب میں آنکھ لگ گئی۔ دیکھا رسول اکرمؐ سامنے کھڑے ہیں، عالم یہ ہے کہ سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں، ستینیں الٰہی ہوتی ہیں، بالوں پر خاک پڑی ہوتی ہے۔

گبرا کر لے جا۔ خدا کے رسول! یہ آپ کا کیا عالم ہے؟ فرمایا، ام مسلم! تم سور ہی ہو۔ میں لٹ گیا، میرا حسین مارڈالا گیا۔ ام مسلم! میرا لگھا جڑ گیا۔ ام مسلم! کربلا میں سب شہید ہو گئے۔ ذرا غور سے تو دیکھو، یہ میرے سر زخاک کیسی ہے، یہ میرے بال کیوں بکھرے ہیں، یہ میں نے استینیں کیوں الٰہی ہیں؟ ام مسلم! میں صبح سے کربلا کے میدان میں تھا میں نے اپنے حسین کا گلا کئے ہوئے دیکھا ہے میں نے اپنے لال کو زیر خبر سے ترپتے ہوئے دیکھا ہے۔ ام مسلم! یہ میرے سر پر کربلا کی خاک ہے اور میرے بدن پر حسین کے خون کی چھینیں ہیں۔

عز ادارو! یہ سُننا تھا کہ ام مسلم ترپ گئیں، گھبرا کر آنکھ کھولی تو خواب رسول اکرمؐ تو نظر آئے ملکیں زبان پر یہ فقرے جا ری ہو گئے۔

وَ وَ أَمْحَمَدًا وَ أَعْلِيَا وَ أَحْسِنَا وَ أَنْتَرَةً فَوَادَا

ارے میرے لال! ارے میرے حسین!

میری زبر ام کے جائے تو کربلا میں شہید ہو گیا۔ میرے حسین! تجھے دشمنوں نے قتل کر دالا۔ کاش کوئی ہوتا تو میرے حسین کو خجرا قاتل سے بچا لیتا۔ کاش کوئی ہوتا جو وقت آخر ایک قطرہ آب دے دیتا۔ مگر افسوس کہ کسی

کو میرے حسین پر رحم نہ آیا، کسی نے نہ سوچا کہ میرا حسین رسول اللہ کی گود کا  
پالا ہے اسے زہراؓ نے بڑی مشقتوں سے پالا ہے، اس کے لیے جنت سے  
لباس آیا تھا، آسمان سے لغتیں آئی تھیں اور آج وہی حسین ایک ایک قطرہ  
آب کو ترسایا گیا۔ ہلے یہ آسمان گر کریں نہیں پڑا، یہ زمین تباہ کیوں نہیں  
ہو گئی، یہ کائنات باقی کیسے رہ گئی جب زہراؓ کی کائنات اُجر طکنی اور پیغمبر  
کا باغ کٹ گیا۔

میں کھوں گا بی بی! آپ تعجب نہ کریں۔ کائنات میں انقلاب آیا ہے  
زمیں ہلی ہے، آسمان سے خون برسا ہے، افتتاب کو گہن لگا ہے، سیاہ  
آنہ ہیاں چلی ہیں، مگر ظالم شمر کو رحم نہ آیا اور اُس نے اپنا بخوبی پلا دیا۔

اَنَا يَدِهِ وَ اَنَا الْيَدُ رَاجِعُونَ  
وَ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا اَيَّ مُنْقَلِبٍ يُنْقَلِبُونَ ۝

---

۳

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ  
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ •

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَ  
السَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْأَنْبِيَاٰ وَالْمُرْسَلِينَ سَيِّدِنَا وَ  
مَوْلَانَا فِي الْقَائِمِ مُحَمَّدٌ وَاللّٰهُ الطَّيِّبُ الطَّاهِرُ  
وَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى أَعْدَاءِهِمْ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ أَمَّا بَعْدُ  
فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكِتَابِ  
”وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ“ يٰ

ارشادِ جنابِ ربِ العزتِ ہے : ” اور محمد صرن میرے رسول ہیں“  
میرے رشتے کے بعد کسی دنیادی رشتے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ میرا ہے  
میرا، میرے علاوہ کسی کا کچھ نہیں ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ جب رسول اکرمؐ کی زندگی میں ہر انسان کی طرح  
بیشمار سیلوپاے جاتے ہیں اور آپؐ کی حیاتِ طیبہ بھی مختلف رشتوں میں  
اسیر ہے۔ تو مالکِ کائنات کے اس ارشاد کا مطلب کیا ہے۔ اس سدی میں

مختلف ادوات میں مختلف توجیہات بیان کی جا چکی ہیں۔ آج ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ کمرل عظیم کی زندگی کا کوئی گورنر اور کوئی پیر ہو قابل انکار نہیں ہے۔ آپ انسان ہیں تو انسانی زندگی کے تمام تعلقات بھی رکھتے ہوں گے، لیکن دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب کسی مال کی کسی کارخانے کی مہر اور اُس کی چھاپ نہیں ہوتی تو خریدار کو مال کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ اور اس کا مادہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اُس کی ساخت و پرداخت پر نظر کرنا پڑتی ہے لیکن جب معین کارخانے کی مہر یا چھاپ مل جاتی ہے تو مادہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور کارخانے کے اعتبار پر سودا کر لیا جاتا ہے۔ اب اگر مال خراب بھی ہو گا تو یعنی والے سے کوئی باز پر سس نہ ہوگی، بلکہ اُس کارخانے کے مالک سے بات کی جائے گی جس نے اُس مال کو بنایا ہے، اور اُس پر اپنی مہر لگا کر کارخانی کا ردایجاد کیا ہے۔

اُس مہر اور چھاپ کا ایک فائدہ مال کے اعتبار اور عدم اعتبار کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے یہ بھی پہچان بیا جاتا ہے کہ یہ مال کس کارخانے کا ہے اس کی ساخت پرداخت کس ملک میں ہوتی ہے اور اس کی صفات اور گارانتی کا اعتبار کتنا ہے۔

مکینیاں اپنی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لیے اتنی بھی ضمانت دیتی ہیں جتنا اُنھیں اپنے مال پر اعتبار ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مال میں بقاکی صلاحیت دو سال کی ہو اور ضمانت دو سو کی دے دی جائے اور نتیجہ میں ساری کمپنی بنام ہو جائے اور اُسے دنیا کی نگاہوں میں بے اعتبار قرار دے دیا جائے۔

ضمانت کا اصول بھی یہ ہے کہ ضمانت زبانی نہیں ہوتی بلکہ ایک تحریر کی شکل میں ہوتی ہے جسے خریدار اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے تاکہ وقت ضرورت کارخانے کے مالک کو دکھا کر اُس سے یہ طالب کر سکے کہ اپنے دس سال کی ضمانت کا کارڈ دیا تھا اور یہ مال دو سال میں خراب ہو گیا۔

مثال کے مادی خصوصیات کو الگ کرنے کے بعد مگر کارڈ و عالم کی دولوں حیثیتوں کا سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ آپ بیک وقت مگر مدینی عربی اور ہاشمی بھی ہیں اور اللہ کے نبی و رسول بھی۔ لیکن مالک کائنات نے تمام حیثیتوں کو نظر انداز کر کے صرف رسالت کو یقینی رکھا ہے۔

بتاتا یہ ہے کہ اس چھاپ کو دیکھنے کے بعد مادی حیثیتوں پر نظر کرنا خلافِ عقل والنصاف ہے۔ اب تم یہ نہ دیکھو کہ یہ عبد اللہ کافر زندہ ہے مگر کے گھروں میں پیدا ہوا ہے، ہاشمی گھرانے سے عشق رکھتا ہے، عربی زبان میں کلام کرتا ہے۔ بلکہ صرف یہ دیکھو کہ یہ ہمارا رسول ہے، ہمارا نمازد ہے، ہمارا فرستادہ ہے، ہمارے دست قدرت کا مستوار ہوا ہے۔ اس کی ذات اس کے صفات اور اُس کے کردار پر ہماری چھاپ ہے اسے ہم نے اپنا نیا لیا ہے اسے ہم نے اپنی ذات کے ساتھ مخصوص کر لیا ہے۔

اب اگر اس میں حُسن ہے تو ہمارا ہے اور تمہاری نظر میں کوئی برائی ہے تو اُس کی نہیں وہ بھی ہماری بھی ہے۔ اب تمہاری عقل اور تمہاری سمجھ میں ہے کہ تم ہماری مخصوص صنعت میں عیب نکال سکو۔

یاد رکھو! دنیا میں ہر صنایع اپنی صنعت کی ضمانت لیتا ہے۔ میں نے

یعنی اپنی صفتِ خاص کی صفات لی ہے۔ یہ کوئی بے عقل مصنوع نہیں ہے کہ اس کی مادی پائیداری کی صفات لی جائے۔ یہ صاحبِ عقل و بیوش ہے۔ صاحبِ فکر و نظر ہے۔ اس لیے میں نے اس کے جسم کی بقا کی بھی صفات لی ہے اور اس کے فکر و نظر کی سلامتی کی بھی صفات لی ہے۔ اہلِ دنیا ظلم وجود کا نشانہ بناتیں تو اس کے جسم میں ضعف نہیں آسکتا اور ساری دنیا مل کر اس کی فکر و نظر پر حملہ کرنا چاہلے ہے تو اسے محروم نہیں کر سکتی۔ اس لیے کہ جسم تک اہلِ دنیا کو کہ رسائی ہے، وہ اسے محروم اور زخمی بناسکتے ہیں اور روح تک کسی کی رسائی نہیں ہے اس کا براہ راست ہم سے رالیط ہے۔

تم نے دیکھا نہیں کہ ہم نے اپنے جیب کے کردار کی صفات میں کوئی قیمة اٹھا نہیں رکھا۔

دنیا کے انسان، دو قسم کے ہوتے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جن کے قول ہی کا کوئی اعتیاز نہیں ہے۔ دن بھر ہمہ عمل بآیس کیا کرتے ہیں اور یہے ربط دعوں میں دل کو بہسلایا کرتے ہیں۔ اور کچھ وہ ہوتے ہیں جو مقام قول میں صداقت و دیانت سے کام لیتے ہیں، لیکن منزلِ عمل میں ان کے قدم میں لغزش آجائی ہے۔

ہم نے اپنے جیب کے کردار کی صفات میں دلوں بالہن پر نظرِ محکم ہے۔

قول کی صفات لی ہے تو اعلان کر دیا ہے:-

”وَمَا يُنْبِطُقُ عَنِ الْهُوَى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْدَهُ يُؤْخِذُ“

(سورہ والجیم آیات ۲-۳)

اور کردار کی صفات لی تو صاف کہہ دیا :-

”وَمَا رَأَيْتَ أَذْرَقَيْتَ وَلِكَنَّ اللَّهَ رَحِيمٌ“  
”میرے حبیب! یہ سنگریزے تم نے نہیں پھینکے ہیں، یہ  
سنگریزے (ہم) اللہ نے پھینکے ہیں۔“

نبی کا قول ہمارا قول ہے، نبی کا فعل ہمارا فعل ہے، نبی کا عمل  
ہمارا عمل ہے، نبی کی رفتار و گفتار ہماری رفتار و گفتار ہے خیردار!  
میرے حبیب کے کردار پر کوئی اعتراض نہ کرنا۔ اب یہ اس کا کردان ہے، ہے  
یہ ہمارے اشارہ و حجی کے نمونے ہیں جو اس کی زندگی میں ظاہر ہو رہے ہیں  
و کسی کی تعریف کر رہا ہے تو گویا ہم کر رہے ہیں۔ وہ کسی کی مذمت کر رہا ہے تو  
گویا ہم کر رہے ہیں۔ وہ کسی کو اپنے کاندھے پر بٹھا رہا ہے تو وہ بھی ہمارا ہی عمل  
ہے اور کسی کو محفل سے اٹھا رہا ہے تو وہ بھی ہمارا ہی اشارہ ہے۔

دل چاہتا ہے کہ عرض کروں میرے ماںک دنیا کے صنایع جب لپٹے  
مال کی ضمانت یلتے ہیں تو ایک گانٹی کارڈ بھی دیتے ہیں تاکہ اگر کبھی  
مال میں کوئی عیب نظر آئے یا کوئی نقص پیدا ہو جائے تو اس کارڈ کو دکھلا کر  
ماںک سے حساب کر سکیں تو نے اپنی صنعتِ خاص کی ضمانت کے مابے  
میں کیا انتظام کیا ہے۔ تیری ضمانت کا ثبوت کیا ہے۔

عجب نہیں قدرت جواب دے۔ تو نے غور نہیں کیا میں نے اپنی  
صنعت پر مختلف مُہریں لگادی ہیں۔ اس کے دوام واستحکام کی مختلف  
نشأتیاں مقرر کر دی ہیں۔ دیکھو اس کی پشت پر نسبت کی مُہر ہے اس کی  
انگلیوں پر شق القمر کی مُہر ہے۔ اُس کے قدم پر منزلِ قوئین کی مُہر ہے اور اس کے

ہاتھوں پر سنگریزوں کے تیج کی مہر ہے۔

ان سب باتوں کے علاوہ ایک صفات کی کتاب بھی ہے جس کا نام ہے  
قرآن۔ یہ خود رہے یاد رہے، یہ قرآن تمہارے درمیان رہے گا اور پڑھ  
ہن کر رہے گا۔ اب سے لیکر صبح قیامت تک، جب بھی نبوت کے کردار میں  
کوئی خرابی یا کمزوری نکل آئے، یہ قرآن میرے پاس لیکر آجانا، میں دیکھوں  
گا کہ تم نے میری صنعت میں کیا عیب نکالا ہے اور میرے جبیں کا کردار  
کتنا طیب و طاہر ہے۔

یاد رکھیے، دنیا کے کارخانوں کی طرف سے جو گارنٹی مبک ملتی ہے،  
اُس میں صفات کی میعادِ الکھی رہتی ہے۔ اس وقفہ کے درمیان مال میں عیب  
نکل آئے تو مرمت بھی ہو سکتی ہے، بدلا بھی جاسکتا ہے، اصلاح بھی ممکن ہے  
لیکن اس کے بعد کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی اور وہ گارنٹی مبک یہی کارزار صورت کی  
جائی ہے۔

مالک کائنات کی صفات کا اندازہ اس سے بالکل مختلف ہے اس نے  
کردار رسولؐ کی ابدی اور دائمی صفات لی ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ نبیؐ  
کو اٹھایا، لیکن قرآن کو نہیں اٹھایا، تاکہ مجھ پر ایمان رکھنے والوں کے پاس ایک  
 دائمی سند رہے کہ میرے جبیں کا کردار کتنا طیب و طاہر اور پاک و پاک نہ ہے  
عزیزانِ محترم! دنیا کا اصول ہے کہ جب کسی مال پر کارخانے کی مہر  
لگ جاتی ہے تو ارباب عقل و داش مادہ کو نہیں دیکھا کرتے بلکہ کارخانے کے  
اعتماد پر سودا کیا کرتے ہیں۔ مادی اسیا کا تجزیہ کارخانے کی صفات کے

کھلی ہوئی توہین تصوّر کیا جاتا ہے۔

مالک کائنات بھی یہی سمجھانا چاہتا ہے کہ حب تک نہیں نے اپنے  
ضمانت کا اعلان نہیں کیا اس تھا تھیں حق تھا، تم اس کی خلقت پر نظر کرتے  
اس کے خاندان کو دیکھتے، اس کے قوم و قبیلے کا جائزہ لیتے، لیکن جب یہم نے  
ضمانت لے لی تو اب تھیں کسی بات پر نظر رکھنے کا حق نہیں ہے۔ اب تو صرف  
ہم پر اعتبار کا سودا ہے اور بس۔ !

یہاں تک آنے کے بعد میں دنیا سے اسلام سے کہنا چاہتا ہوں کہ  
قرآن کریم میں ”وَمَا حَنَدَ إِلَّا رَسُولٌ“، کا اعلان نہ ہوتا تو  
تم رسول کی بشری زندگی کا جائزہ لیتے، اس میں عیب نہ کالے، ان کی صلح پر  
اعتراض کرتے، ان کی جنگ پر حملہ کرتے، ان کی تعظیم پر زنگلیاں اٹھاتے، ان  
کے اخلاق کو نشانہ اعتراض بنلتے۔ ان کے تسمیں میں براہی ملاش کرتے، ان کی  
عقل پر بذیان کا شہبہ کرتے۔ لیکن جب رب العالمین نے ضمانت لے لی تو  
اب تھیں کسی اعتراض کا حق نہیں ہے۔ اب تو صرف خدا پر ہمدردی کرنا یا پر گا  
اور اگر اعتراض کا شوق پیدا ہو، تجسسی کی ہوں پیدا ہو تو یاد رکھنا کہ یہ نبی کے  
صلح و جنگ پر اعتراض نہیں ہے، یہ خدا کی صلح و جنگ پر اعتراض ہے۔ یہ  
رسول اکرم ﷺ کے دماغ پر حملہ نہیں ہے، یہ مرکز وحی الہی پر حملہ ہے۔

یاد رکھو! کہ نبی پر حملہ کرنے والا اسلام بچا بھی رے جاتے لیکن خدا پر  
حملہ کرنے کے اسلام نہیں بچ سکتا اس لیے کہ بشریت کا پہلو نبوت کی زندگی  
میں تراشا جاسکتا ہے، وحی الہی میں بشریت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

بیشتری اور زیست کے امتیاز کا تحفظ ہی تھا جس نے سر کار سید الشہداءؑ کو مدینہ چھپوڑ کر بلا جانے پر مجبور کر دیا۔ یزید دنیا کو سمجھانا چاہتا تھا کہ محمدؐ مجھی ایک انسان تھے، ان کے پیلوں میں بھی انسانی دل تھا۔ ان کے دل میں بھی انسانی خواہشات کا سمندر موجود تھا اُنھوں نے یہ سب پکھ ملک گیری کی ہوں میں کیا تھا۔ ان کا ڈھونگ مال و دولتِ دنیا کے لیے تھا۔ رسالت کوئی شے نہیں ہے۔ وحی کی کوئی حقیقت نہیں ہے یہ صرف قوم پر حکومت کا ایک جزء ہے تھا جس نے ان الفاظ کے تراشنا پر آمادہ کیا تھا اور فرزند رسول اللشقلینؑ اپنی قربانی سے اس حقیقت کو واضح کر دینا چاہتے تھے کہ جس کے دل میں حکمرانی کا حذرہ ہوتا ہے، جو قوم کی گرد نوں پر سوار ہونا چاہتا ہے، جو اپنے دل میں ملک و مال کی ہوں رکھتا ہے، وہ حیان لینا جانتا ہے۔ حیان دینا نہیں جانتا اور میں حیان دینے کے لیے آمادہ ہوا ہوں تاکہ دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ جس نبیؐ کا الواسد اور حسیں رسولؐ کا وارث تخت و تاج کی ہوں سے یہ نیاز ہو وہ رسولؐ کتنا پاکیزہ کردار ہو گا۔

حسین ابن علی علیہما السلام کا تھوڑے سے سامنیوں کے ساتھ عورتوں اور بچوں کو لیکر براکی طرف نکل جانا ہوا اعلان تھا کہ ہوں حکومت والے اس انداز سے نہیں نکلا کرتے۔ دولت کے طلبگار تھے ایک ستم کو فرنہیں بھیجا کرتے۔ ملک حاصل کرنے والے عورتوں اور بچوں کو لیکر صحراؤں کا سفر نہیں کیا کرتے۔ لڑائی کی تیاری کرنے والے فوجِ دشمن کو پانی نہیں پلایا کرتے۔ جنگ پر آمادہ ہونے والے دشمن کو دیکھ کر نہ کاکنا را نہیں

چھوڑا کرتے۔ لیکن میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں، تاکہ دنیا پر ہیجان لے کر حکومت والوں کا انداز اور بہوتا ہے اور رسالت والوں کا انداز اور جنگ کرنے کے اس طبیعت اور سبتوں نے ہیں اور جہاد کرنے کے سلسلے اور حکومت والے فوجوں پر فوجیں طلب کرتے ہیں اور رسالت والے چراغ بُجھا کر ساتھیوں کو خصت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ جنگ والے سپاہیوں کو جمع کرتے ہیں اور جہاد والے چھپینے کے نیچے کو میدان میں لاتے ہیں۔

دین و مذہب کے تحفظ کا یہی جذبہ یہ ہوتے امام حسین علیہ السلام دوسری حرم کو صحرائے کربلا میں وارد ہو گئے۔ راستے میں ہر کے لشکر نے روکا آپ نے ہر کو سمجھایا لیکن لشکر نے ماننے سے انکار کر دیا۔ آپ نے ہر کے رسالے کے پیاس سے انسانوں اور جانوروں کو سیراب بھی کیا لیکن اس کے باوجود دشمنوں کو حرم نہ آیا۔ صرف ایک ہر کا دل تھا جو بار بار پیچ رہا۔ حق لیکن ابھی عزم میں وہ پختگی نہیں آئی تھی کہ دولت و حکومت کو ٹھوکر مار کر حلا آتا۔ ابھی ہر اخیں ہنڑلوں میں ہے کہ امام کے سامنے نمازِ جماعت قائم نہیں کرتا، بلکہ خود امام حسین علیہ السلام کی اقتدار میں نماز ادا کرتا ہے۔ حسین کی اقتدار اور لشکر ابن زیاد کی سرداری۔ یہ کیسے ممکن ہے؟

یہ خیال آنا تھا کہ ہر نے طریقے ہوتے امام حسین علیہ السلام کے گھوڑے کی بجائما پر باقاعدہ دال دیا۔ فرزند رسولؐ کو جلال آگیا۔ فرمایا: ہر! تیری ماں تیرے ما تم میں میٹھے کیا کر رہا ہے؟

اصحاب غصہ میں بھرے ہوئے اس منتظر کو دیکھ رہے تھے، لیکن امام حسین علیہ السلام نے کوئی اقدام نہیں فرمایا، صرف ایک موڑ فقرہ ارشاد فرمایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حُرّ نے دبی آواز میں عرض کی:

فاطمہ کے لال! اگر آپ کی مادر گرامی فاطمہ زہرا زمیں تو میں بھی جواب دیتا لیکن کیا کروں دختر رسولؐ کی شان میں گستاخی نہیں کر سکتا۔ قافلہ آگے بڑھ گیا، لیکن حُرّ کے دل میں یہ کھٹک رہ گئی حسین فرزند فاطمہ ہی حسین کا خون بہلانے کا مطلب فرزند فاطمہ کا خون بہانا ہے۔ حسین پر پانی بند کرنے کا مطلب ساقی کوثر کے لال کو پیاسار کھانا ہے۔ یہی چذبہ بھائیں نے شبِ عاشورہ حُرّ کو سیدار کر دیا اور صبح ہوتے ہوئے حُرّ، امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ گیا۔

چلا تو اس انداز سے چلا کہ فوجِ دشمن کو امام حسین علیہ السلام کے پیاس یاد دلا کے چلا۔

ایک سپاہی سے پوچھا تو نے اپنے گھوڑے کو پانی پلا لیا ہے۔؟ اُس نے کہا ہم برابر پانی پلا رہے ہیں، گرمی کی شدت سے جالوں پیتاں ہو رہے ہیں۔

حُرّ نے ایک آہ سرد گھینچی۔ اللہ! فوجِ یزید کے جالوں سیراب ہوں اور ساقی کوثر کی اولاد پیاسی کیا رہے۔

یہ کہہ کر آگے بڑھے گھوڑے پر سوار ہوتے، گھوڑے کو ایڑ لگانی تیزی سے بڑھتے تھے کہ بیٹھے نے آواز دی۔ باپ نے مرٹ کر پوچھا کیا ارادہ ہے؟

کہا، آپ کے ساتھ قربان ہونے کا عزم ہے۔

بیٹے کو ساتھ لیا۔ امام کی خدمت میں پہنچے۔ اصحاب نے استقبال کیا  
جسے دوڑ کر سر امام کے قدموں پر رکھ دیا۔ فرزند رسول؟! کیا خطاط معاف ہو گی؟  
امام حسین علیہ السلام نے فرمایا، حُرُّ، قدموں سے سراٹھا لے جُرُّ، فرزند  
فاطمہ کو شرمندہ نہ کر۔

حُرس نے کہا مولا! اب جیکہ میری خطاط معاف نہ ہو گی، یہ شرمندہ نہ گا۔  
امام نے فرمایا، اے حُرُّ! میں نے تیری خطاط کو معاف کیا، میرے خدا  
نے معاف کیا۔ حُرُّ! اب تو سراٹھا لے۔

حُرس نے عرض کی مولا! مجھے یاد ہے کہ سب سے پہلے آپ کا راستہ  
میں نے ہی روکا تھا آپ کے سامنے یہ صائب میری ہی وجہ سے آئے ہیں۔  
آقا، سوچتا ہوں کہ اگر آج میں نے راستہ نہ روکا ہوتا تو آپ اس بلال کے  
بن میں کیوں آتے؟! اگر آپ نے میرے لشکر کو سیراب نہ کر دیا ہوتا تو آپ کے  
پیچے العطش اعطش کی آوازیں کیوں بلند کرتے۔

حُرس کا ایک ایک موئے بدن سرکار سید الشہداء سے التماس کر رہا  
تھا مولا، مرنے کی اجازت دیجیے۔

حُرس کے مسلسل اصرار پر امام حسین علیہ السلام تو کچھ نہ کہہ سکے، البتہ بائی  
غیرت نے آواز دی۔ حُرس! یہ کیا کہہ رہا ہے؟ اسے کوئی جھمان کو مرنے کے  
لیے بھیجا ہے۔ سکسی نے فریاد کی حُرس! فرزند رسول شرمندہ ہے کہ تیری کوئی  
خاطر نہ کر سکا، اب مرنے کا نام لے رہا ہے۔

حُسر کا ضمیر برابر اصرار کرتا رہا۔ اور آخر کار اجازت نہ ملنے پر حُسر نے آواز دی۔ فاطمہ کے لال! علیٰ کے نو تنظر! اے کریم ابن کریم! کیا غلام کی کوئی بات نہ مانیں گے؟

فرزندِ رسول نے فرمایا: حُسر! اور کیا کہنا چاہتا ہے؟

حُسر نے با تھوڑے عرض کی، آقا! اگر مجھے مرنے کی رضاہیں دیتے تو میرے بیٹے ہی کو جانے دیجیے۔

ارباب غیرت سوچیں، حسین کے دل پر کیا گذگئی ہوگی۔ اور مظلومیت کا کیا عالم ہوگا کہ حُسر جوان بیٹے کو مرنے کی اجازت دلوار ہے ہیں۔

فرزندِ رسول نے سرخیکا کر فرمایا، حُسر! اگر تیری یہی مرضی ہے تو جامیں نے اجازت دی۔

حُسر کے چہرے پر بنشاست کے آثارِ دوڑ گئے۔ مسکرا کر بیٹے کو گلے سے لگایا، سر پر عمامہ باندھا، زرد پہنائی، کمر سے تنوار لگائی، گھوڑے پر سوار کیا اور کہا، جامیرے لال خدا حافظ۔ بیٹا! جلتے ہو تو گلا کٹوادیں۔ میرے لال! آج تیری شہادت سے تیرا باپ فاطمہ کے لال کے سامنے سُڑخرو ہو گا۔

بیٹا، باپ کو آخری سلام کر کے چلا، میدان میں آیا۔ جہاد کا سلسہ شروع ہوا۔ دشمن میں جوشِ انتقام اُجھرا۔ ایک آواز آئی۔

یہ ایجھی ادھر سے ٹوٹ کر گیا تھا، اس نے شکری زیستی کی ساکھ خراب کی ہے، اس نے ہماری فوج سے علیحدگی اختیار کی ہے۔ اس چاروں

طرف سے گھیر لیا جائے اور اس کے حجم کے برابر ٹکڑے کر دیے جائیں  
خُشْر کا فرزند یہ ساری آوازیں سُننا رہا اور نہایت لے جگدی کے  
سامنے مصروف کا رزارہ رہا۔ آخر کار جب زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے  
گرنے والوں پاپ کو آواز دی۔

بایا آئیے! غلام آپ کا آخری دیدار کرے۔  
خُشْر کے کالوں میں آواز آئی۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر کوئی کس کے  
باندھا اور میدان کا رُخ کیا۔ فرزند رسولؐ کو خیر ملی۔

فرمادیا، خُر! تیر کیا ارادہ ہے؟

خُسْنے نے کہا، آقا، بیٹے نے یاد کیا ہے۔ اس کے سرہانے چار یا ہو  
یہ سُننا تھا کہ فرزند رسولؐ کا دل ٹپ گیا، آواز دی خُر! یہ کیا  
غضب کر رہا ہے۔ اسے میرے وفادار شیر! یہ کیا ارادہ کر لیا ہے۔  
خُر! کیا اپنے سامنے جوان بیٹے کو اپنے بیان رکھتے ہوئے دیکھے گا۔؟  
حکِمِ امام سے مجبور خُر نے دل کو سنبھالا، قدموں کو روکا، ہلکی چھپ کر  
کر پیٹھ گئے۔ فرزند رسولؐ اصحاب کے سامنے ہٹھے۔ خُر کے جوان کا  
لاشہ اٹھایا۔

دل چاہتا ہے عرض کروں، فاطمہ کے لال! اک بلا کے مظلوم مسافر!  
خُشْر اپنے جوان کو اپنے بیان رکھتے ہوئے نہ دیکھے گا، خُشْر اپنے جوان کا  
لاشہ نہ اٹھاتے گا۔ لیکن مولا! اُس وقت کیا کیجیے گا جب علیٰ اکبُر کا  
آخری وقت ہو گا۔ جوان کا سر آپ کے زانوپر سو گا۔ بیٹا اپنے بیان رکھتا ہو گا۔

٢

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَنِ الرَّجِيمِ •

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ •

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ  
وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ النَّبِيَّاءِ وَالْمُرْسَلِينَ سَيِّدِنَا وَ  
مَوْلَانَا أَيْتَ الْقَاسِمِ مُحَمَّدٌ وَاللَّهُ الطَّيِّبُونَ الطَّاهِرُونَ  
وَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى أَعْدَاءِ إِثْمِهِمْ أَيْتَ يَوْمَ الدِّينِ أَمَّا بَعْدُ  
فَقَدْ قَالَ اللَّهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكِتْرِيمِ  
” وَمَا هُمْ بِإِلَّا رُسُولٌ ”

حضرت رب العزت اپنے حبیب کی عظمت و جلالت کا اعلان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔ ” اور محمد صرف میرا رسول ہے ” اور لیں۔ رسالت کے علاوہ اس کی زندگی میں اور کسی پہلو کا تلاش کرنا اس کی عظمت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ یہ میرا ہے اور صرف میرا ہے میرا ہے علاوہ اس کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے اور جو رشتہ ہے اس پر میرا ہے

رشتے کی چھاپ ہے۔ یہ پہلے میرا ہے اس کے بعد کسی اور کلمے اور جس کا بھی ہے میرے ہی رشتے سے ہے۔ مجھ سے رشتہ توڑنے کے بعد کوئی اس سے رشتہ قائم کر لے، یہ نامکن ہے۔ اور اس کی رسالت کا سہارا لیلے بغیر کوئی مجھ تک پہنچنے جاتے یہ بھی نامکن ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ اس حقیقت کا اعلان ان لفظوں میں بھی ہو سکتا تھا جن لفظوں میں ہم عام طور سے حضور مسیح و رکاسنات کی رسالت کی گواہی دیتے ہیں اور قرآن مجید نے بھی دوسرے مقام پر تذکرہ کیا ہے یعنی ”**مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ**“ (سورہ فتح)۔

لیکن نہ جانتے کیا مصلحتِ الہی ہے کہ اُس نے اس مقام پر رسول کی رسالت کا اعلان کرنے کے بجائے رسالت کے حصر کا اعلان کیا ہے اور یہ نہیں کہا کہ محمد ﷺ کے رسول ہیں، بلکہ یہ اعلان کیا کہ محمد صرف اللہ کے رسول ہیں اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔

اس نکتہ کا اندازہ کرنے کے لیے پہلے یہ سوچنا پڑے گا کہ ان دولوں لہجوں کا فرق کیا ہے اور عرب کس مقام پر س لہجہ کو اختیار کرتے ہیں۔ آپ عربی زبان کا جائزہ لیتے چلے چلئے، آپ کو یہ بات محسوس ہو جائے گی کہ عرب جب بھی کسی بات پر زور دینا پاہنچتے ہیں اور اس کی غنی معمولی عنعت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو وہاں یہی لہجہ اختیار کیا جاتا ہے۔

زید کو عالم کہنا بھی اس کے علم کا اعلان ہے اور صرف عالم کہنا بھی لیکن فرق یہ ہے کہ عالم ہونے کے ساتھ دوسرے حالات و کیفیات کا

احتمال رہ جاتا ہے جو علمی زندگی کو مشکوک و مشتبہ اور کمزور بینا دیتا ہے۔ لیکن صرف عالم ہونے کے بعد ایسا کوئی امکان نہیں رہ جاتا اور اب یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کا ہر پہلو علمی ہے۔ یہ امکھتاتا ہے تو عالمانہ انداز سے، بیٹھتا ہے تو عالمانہ طریقے سے، سوچتا ہے تو عالمانہ رنگ میں اور بات کرتا ہے تو عالمانہ لمحے میں۔

قرآن حکیم نے بھی قدم قدم پر اشیاء کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے یہی لہجہ اختیار کیا ہے۔ یہ بات تو بہت آسان ہے کہ ہم نے انسان کو اپنی بنتگی کے لیے پیدا کیا ہے لیکن یہ بات بہت بلند ہے کہ ہم نے اس کو صرف اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ بندگی کے لیے پیدا کرنے میں غیر بستگی کا امکان پایا جاتا ہے۔ لیکن صرف بندگی کے لیے پیدا کرنے میں ایسا کوئی امکان نہیں ہے۔

سرکارِ دو عالم نے بھی مالکِ کائنات کی عظمت کا تعارف کراتے ہوئے مکر کی گلیوں میں جونعرہ بلند کیا تھا وہ اسی لہجے میں تھا۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ خدا کو موجود یا ایک مالو۔ بلکہ آپ کام طالبہ یہ تھا کہ سوائے خدا کے کسی کو خدا نہ مانتا۔ لیٹا ہر ایک ہی چیز ہے لیکن اس میں ایک ذہنی تربیت کا نکتہ ہے جس کے بغیر اسلام اپنی تربیت میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

خدا کو ایک مانتے کا عقیدہ خدا کی طرف متوجہ تو کر سکتا ہے اس کی عظمت کے سامنے تسلیم جھک کا سکتا ہے۔ اس کی بارگاہ نیاز میں سجدہ

کر سکتا ہے لیکن غیر خدا کے سامنے سر بلند نہیں کر سکتا اسلام بھی چاہتا ہے کہ بتہ اپنی زندگی اس درمیانی راستے سے گذارے کہ بندوں کا سامنا ہو تو سرفراز و سر بلند ہو جائے اور مالک کی بارگاہ نیاز میل جائے تو سجدہ میں سر جھیکا دے۔

ذہن پر عقیدہ رو بیت کا بار بھی رہے اور دل و دماغ غیر کی بندگی سے آزاد بھی ہو جائیں۔ دماغ کو سکون بھی مل جائے اور دل سر بسجہ بھی ہو جائے۔

لا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کی تراش و تراش اور اس کے لہجہ و انداز نے ذہن مسلم کو نظریات و افکار کی اس بلندی تک پہنچا دیا ہے جہاں خدا کے علاوہ کوئی چیز ذہن میں سماتی ہی نہیں ہے وہ کائنات کی جس شے نظر ڈالتا ہے لا إِلَهُ کی صفت میں اپنے برابر بھی پاتا ہے شمس و قمر ارض و سما، لیل و نہار، دشت و جبل، انسان و حیوان کوئی ایسا نہیں ہے جس کے سامنے مرتیزم کیا جائے اور اس کی خدائی کا اقرار کیا جائے وہ پیاروں کی بندگی کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے لا إِلَهُ دریاؤں کی روائی کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے لا إِلَهُ، لیل و نہار کی آمد و رفت کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے لا إِلَهُ، تو کہتا ہے لا إِلَهُ، شمس و قمر کی تابانیوں کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے لا إِلَهُ کوئی خدا نہیں ہے اور حب اُن میں کوئی خدا نہیں ہے تو نہ اُن سے ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ اُن کے مقابلے میں احساسِ مکتبی کاشکار ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ اپنی تمام قولوں، ذخیروں اور رعنائیوں کے ساتھ اُس

خدا کی مخلوقات ہیں جس نے ہمیں پیدا کیا ہے کہ انھیں عقل و خرد سے محروم رکھا ہے اور مجھے عقل کی بلندیوں سے بہرہ و رکھا ہے۔ یہ اپنا درد دل سُنا نہیں سکتے اور میں ماجراتے زندگی بیان کر سکتا ہوں۔ یہ بندگی کے احساس سے بھی محروم ہیں اور مجھوں میں عذر و مبعود کے رشتے باقی ہیں۔ یاد رکھیے جس لہجہ و انداز میں مرسل اعظم نے رب العالمین کے عظمت کا اعلان کیا ہے۔ اسی لہجہ میں مالکِ کائنات نے اپنے حبیب کی پاکیزہ سیرت کا تعارف کرایا ہے۔ اب اس کی زندگی میں رسالت کے علاوہ کوئی پہلو تلاش نہ کرنا۔ یہ رسول ہے اور صرف رسول ہے اور میرا رسول ہے۔

اتنا فرق ضرور ہے کہ میری حیات کوئی مادی حیات نہ تھی، میرا رشتہ مادی رشتہ نہیں تھا، میری زندگی زبان و مکان اور جسم و جسمانیات سے بالآخر تھی۔ میں ”لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ“، حیثیت کا مالک تھا اس لیے میری زندگی اور میرے افعال میں مختلف حیثیتیں نہیں نکالی جا سکتی تھیں۔ میرے دشمنوں نے میری عظمت کو کھٹانے کے لیے کفر و شرک کا پہلو زکالا۔ کبھی میرے وجود ہی کا انکار کر دیا گیا اور کبھی میرے مقابلے میں دوسرا خدا لاکر کھڑے کر دیے گئے۔ اب میرے رسول کا فرض تھا کہ وہ میری عظمت کا اعلان کرتے ہوتے میری توحید کا تحفظ کرے اور یہ بتائے کہ مجھے جیسا کوئی دوسرا خدا ممکن نہیں ہے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور تچھر کھا کر، کانٹوں پر چل کر، لہو میں نہما کر، مرصاص بائیٹ اٹھا کر ایک ایک

گلی اور ایک ایک کوچہ میں اعلان کر دیا۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔ وہ کائنات کا خالق و مالک ہے اور سب اسی کی مخلوق ہیں، اور رسول کی زندگی سیکڑوں ماڈی رشتتوں میں گرفتار تھی اس کی زندگی کے بارے میں شرک کے امکانات پیشمار تھے۔ اس کے کردار کو متعدد جمیتوں سے مشکوک بنایا جا سکتا تھا اس کے اعمال کے تقدیس پر پیشمار اعتراض کے پہلوں کا لے جا سکتے تھے اور میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے علاوہ دوسرا نی ہے میں نے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی بھیجے ہیں۔ میں نے آدم سے یہ کہ خاتم تک مسلمین کا ایک سلسلہ قائم کیا ہے میں نے ہر دو مریں بذریعۃ کا ایک معقول انتظام کیا ہے میں یہ کیونکہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا نبی نہیں ہے۔ اور نہ دوسرے کے نبی ہونے سے میرے نبی کی عظمت پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے۔ میرے علاوہ دوسرا خدا ہو جائے تو ساری خدائی یا طل و بیکار ہو جائے۔ نبی کے علاوہ دوسرے نبی ہیں۔ اور ان کی نبوت و رسالت پر کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ سید المرسلین بھی ہیں اور خاتم النبییں بھی، وہ نمائندہ الہی بھی ہیں اور صاحب کتاب و شریعت بھی۔ وہم نے بھی ان کے بارے میں دوسرے انبیاء کے عقیدے کو ان کی توبین و تذلیل کا ذریعہ نہیں بنایا۔ بلکہ کھلے ہوئے دشمنوں نے سرے سے ان کی نبوت کا انکار کیا:

”يَقُولُوا إِلَّا ذِيْنَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا“

اے میرے حبیب! کفار یہ ”کہتے ہیں کہ آپ (ہمارے) رسول  
نہیں ہیں یا“

اور پچھے ہوتے منافع دشمن نے اس کی زندگی کی پاکیزگی اور اس کے  
کردار کی عظمت کو مجرور ہبنا یا۔ اب میر افرض ہے کہ میں دونوں طرف پہرے  
پھاکار اس کی عظمت کا تحفظ کروں اور ہر حبیب سے اُس کے کردار کو پاکیزہ  
ثابت کروں میں نے ایک لفظ میں دونوں فرض ادا کر دیے۔

”وَمَا حَمَدَ إِلَّا سُولٌ“

لفظ رسول نے واضح کر دیا کہ یہ خدا کی نمائندہ اور اس کا فرستادہ ہے  
او رغی و اشیات کے لہجے نے ثابت کر دیا کہ اس کی زندگی میں رسالت کے علاوہ  
پچھوں ہیں ہے۔ اس کا ہر عمل رسالت ہے اور اس کا ہر قدم رسالت۔

یہاں تک آنے کے بعد ایک فقرہ کہنے کو جو چاہتا ہے کہ اربابِ حکمت  
کا یہ اصول ہے کہ شخصیتِ حسین رُخ سے اعتراض کیا جاتا ہے اسی رُخ  
سے جواب کا بھی انتظام کیا جاتا ہے اور شخصِ حکیم کا جواب خود اس بات  
کی دلیل بن جاتا ہے کہ اعتراض کس رُخ سے آیا ہے اور شُبہ کس جہت سے  
پیدا کیا گیا ہے۔ آپ کسی شخص کے علم پر زور دیں تو ہم بغیر بتائے یہ سمجھو  
لیں گے کہ لوگ اس کے علم میں شُبہ کر رہے ہیں سخاوت میں نہیں۔ اور  
سخاوت پر زور دیں تو ہم سمجھو لیں گے کہ اس کی سخاوت مشکوک سمجھی جائی ہے  
علم نہیں۔

بعینہ سبی حال اربابِ حکمت کے لہجے کلام کا ہے کہ کلام کا لہجہ خود ہی

غتازی کر دیتا ہے کہ اہل باطل کس رُخ سے شبیہ پیدا کر رہے ہیں اور بات کہاں سے کہاں جا رہی ہے۔

لا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَسَلِيلٌ ہے کہ شمن خدا نے وحدانیت پر اعتنی  
کیا تھا اور مرسل عظیم نے واضح کر دیا کہ دوسرے خدا کا تصور برداشت  
نہیں کیا جاسکتا۔ خدا ایک ہے اور جس ایک ہے نہ دوسری کائنات ہے  
نہ دوسرا پیدا کرنے والا۔ نہ کوئی دوسرانظام ہے اور نہ اس کا چلانے والا  
اور ”وَحَّا حَمْدًا لِّإِلَّا سُنُولٌ“، وسیل ہے کہ شمن رسالت  
نے کروار نبی پیر حملہ کیا تھا، اور اس میں مختلف پہلوں کاں کر کر دار کے تقدس کو  
محروم کرنا چاہا تھا۔ اور خدا نے کریم نے واضح کر دیا کہ یہ صرف رسول  
ہیں اب ان کی زندگی میں رسالت کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

اسی کی روشنی میں یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ احمد کے میدان میں مسلمانوں  
کے فزار کے باوجود مولائے کائنات علی بن ابی طالب علیہ السلام کے جہاد  
میں شبیہ کیا جا رہا تھا اور آگے چل کر یہ کہنے کا جواز نکالا جا رہا تھا کہ احمد  
تنہ علی علیہ السلام نے فتح نہیں کیا بلکہ اس میں ہمارا بھی رہا تھا ہے۔

زبانِ وحی سے بہتر اس سارش کو کون سمجھتا۔ اس نے روز اول یہ  
مسئلہ کو صاف کر دیا۔ لَا فَتْيَ إِلَّا عَلَىٰ“ علیؑ کے علاوہ کوئی  
جو ان نہیں ہے۔ اب نہ کہنا کہ دوسرے افراد بھی احمد کے معركے کو  
سر کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ میدان کو فتح کرنے کے لیے فتحی کی ضرورت ہے۔  
اد علی علیہ السلام کے علاوہ کوئی فتحی نہیں ہے۔

اربابِ کرمِ لہجہ کو لہجہ سے ملائے تو کلام کا لطفِ سمجھیں آئے گا۔  
 دُلَا إِلَهٌ إِلَّا اللَّهُ، وَحْدَهُ لَا شَرِيكٌ کے علاوہ کوئی خدا  
 نہیں ہے اور ”لَا فَتْنَى إِلَّا عَلَيْهِ“، (علی علیٰ اللَّهُ سَلَام کے علاوہ  
 کوئی جوان نہیں ہے۔)

اب نہ دوسرے خدا کا عقیدہ جائز ہے اور نہ دوسرے جوان  
 کا تصور۔ ماننا پڑے گا کہ جس طرح ایک خدا سے یہ کائنات چل رہی  
 ہے ویسے ہی ایک علیٰ علیٰ اللَّهُ سَلَام سے جہاد کی فتح چل رہی تھی۔  
 میں نے عرض کیا کہ مرسلِ عظیمؐ کی حیات پر کفر و نفاق نے دُبھے جائے  
 کیونکہ کُفر نے رسالت کا انکار کیا اور نفاق نے زندگی میں دوسرے گوشے  
 تلاش کیے اور یہی دونوں باتیں یزید کے ایک شعر میں نظر آتی ہیں : یعنی  
 (یہ سب بُنیٰ باشُم کا هسیل ہے ، نہ کوئی وحی آئی ہے نہ خبر)  
 وحی اور خبر کا انکار کھلا ہوا رسالت کا انکار ہے۔ اور ہاشمیت کا  
 حوالہ دلیل ہے کہ یزید، محمد مصطفیؐ کے پاکیزہ کردار کو باشی اڑات کے حوالے کرنا  
 چاہتا تھا۔ سرکار سید الشہب راٹھ نے آواز دی۔ یزید! سرکار جائے یہ  
 ممکن ہے لیکن رسالت سرکار جائے یہ ناممکن ہے۔ اسلام بدنام ہو جائے یہ  
 غیر ممکن ہے۔ یزید! تجھے نہیں معلوم کہ توفیجوں کی کثرت میں کفر و اسلام کے  
 معاملہ کو چھپا کر بُنیٰ باشُم و بُنیٰ اُمیّہ کی جنگ کو جنگِ اقتدار بنانا چاہتا ہے  
 اور میں غریبِ الوطن ہو کر کر بلکہ جنگل میں گلا کٹا کر دنیا پر واضح کر دینا چاہتا  
 ہوں کہ اقتدار کی جنگ کا نقشہ اور سوتا ہے اور حق و حقانیت کے بچانے

کانقشہ اور۔

سر کار سید الشہد اپنے زیر دکی فہم کو ناکامیاب بنانے کے لیے جہاں اور انتظامات یکے وہاں ایک اہم انتظام یہ بھی کیا تھا کہ اپنے نے تھوڑے سے آدمی اپنے ہمراہ لیے، لیکن مختلف قبیلوں سے لیے، مختلف خاندانوں سے لیے، مختلف جگہوں سے لیے، تاکہ جہادِ حق، جنگِ ملک گیری نہیں پاتے، اور مجاہدینِ راہِ خدا کو اقتدار پرست نہ کہا جا سکے۔

اس سے بالآخر ایک انتظام یہ بھی تھا کہ حسین نے اپنی مظلومیت کے سہارے مختلف مذاہب کے افراد کو بھی اپنی طرف ہیچخ لیا کی بھی گروہ یا طل سے زمیر کو زکالا، کبھی عیسائیت کے دامن سے وہب کو زکالا کبھی زیر دیتی کی فوج سے ہر کو زکالا، تاکہ آنے والی قومیں کربلا کی تاریخ پر چیز تو انھیں یہ اندازہ رہے کہ ایک مذہب کے دو بادشاہوں کی لڑائی میں دوسرے افراد اپنا مذہب چھوڑ کر ساتھ نہیں دیا کرتے اور دنیا کا کوئی صاحبِ عقل مظلوم کی ہمدردی میں اپنے دین نہیں چھوڑ دیا کرتا۔ یہ سبھی تدریسی جسیں نے تاریخ کامنہ بند کر دیا اور الزام تراشنے والوں کی زبانوں پر قفل لگا دیے۔

اب نہ کہنا، یہ دو بادشاہوں کی جنگ بھتی۔ یہ دو مسلمانوں کی لڑائی بھتی۔ خبردار! میرے ساتھیوں کا کردار آواز دے رہا ہے کہ حسین حفظت بھتی۔ جب تک کبھی نہ مقصد کی بلندی کو پہچان لیا تو راحت و آرام کو ٹھوکر مار کر کیس حسین کے قدموں میں آگئے۔ اور اپنی آسانی کا کوئی خیال نہیں کیا۔

اریاپ عزا ! اب ذرا سوچ پیں۔ کوئی انسان جس کی عمر جوانی کی ہو  
 نئی نئی شادی کی ہوا اور دلوں کو رخصت کر کے اپنے گھر لے جبارا ہو،  
 اس کے جذبات، اس کی تمنائیں اور اس کی امنگیں اس بات کی اجازت  
 دیتی ہیں کہ وہ اپنی لذتِ حیات کو قربان کر کے ایک غریب الوطن کے ساتھ  
 ہو جائے، اپنے نشاطِ زندگی کو خیر باد کہہ کے ایک سیکس و بے دیار پر اپنی جان  
 قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ نہیں تھیں۔ یہ صرف حیثیت کی  
 حقانیت کی کشش تھی جس نے وہیں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور ایک منزل  
 پر وہیں اپنی ضعیف ماں اور زوجہ کے ساتھ فرزندِ رسول کی خدمت میں  
 حاضر ہو گئے۔

تاریخ کا بیان ہے کہ جب سر کار سید الشہداء کا قافلہ مکہ سے کربلا  
 کی طرف جا رہا تھا تو راستہ میں ایک چھوٹا سا قافلہ نظر آیا جس میں صرف  
 تین افراد تھے۔ ایک ضعیف ماں، ایک بیٹا اور ایک اس کی زوجہ۔ ایک  
 منزل پر قیام کے بعد ماں کے دل میں خیال پیدا ہوا اور اس نے کہا:  
 بیٹا! ذرا جا کر یہ دریافت کرو کہ یہ قافلہ اس لودھوپ کی شدت  
 میں گھر سے کیوں نکل آیا۔ آخر یہ کون لوگ ہیں اور کہاں کا ارادہ رکھتے ہیں؟  
 ان کے قافلے میں تو چھوٹے چھوٹے بچے بھی معلوم ہوتے ہیں، ان کے ساتھ  
 خواتین کی بھی ایک جماعت ہے۔ آخر اخنوں نے اس ہوشیم میں گھر کیوں چھوڑ دیا؟  
 کون سی ضرورت تھی جس نے انھیں اس طرح غریب الوطن کر دیا۔  
 بیٹا نے ماں کا حکم سننا اور دوڑ کر قافلہ کے قریب آیا۔ کسی سے دریافت

سیا، بھائی! کیس کا قافلہ ہے؟ کہاں سے آرہا ہے؟ اور کہاں کا قصد ہے؟ اس قافلے نے اس موسم میں کیوں گھرچھوڑ دیا؟ اور کیا ان لوگوں کے پاس کوئی منزل نہیں ہے جو بچوں اور عورتوں کو سکر نکل پڑے ہیں۔

یہ سننا تھا کہ ایک ساتھی نے ٹرھ کر آواز دی۔ بھائی! بخوبی خبر نہیں ہے میسلمانوں کے رسولؐ کے نواسے حسین بن فاطمہ کا قافلہ ہے جسے امت نے مدینہ میں رہنے منہیں دیا اور اب مکہ ممعظہ سے بھی جدا ہو کر صحراء نوردی میں ھڑک ہے۔ اے بھائی! اس قافلے کی "بظاہر" کوئی منزل نہیں ہے لیکن یہ موت کی طرف جا رہا ہے اور موت اسے لپیے جا رہا ہے۔ رسولؐ اسلام کا نواسہ غریب الوطن ہو کر اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ لو اور دھوپ کی شدت میں مدت سے یونہی سرگرم سفر ہے۔

وہب نے یہ تقریب نی اور درود کر آئے۔ کہنے لگے مادر گرامی!

غضب ہو گیا۔ یہ تو مسلمانوں کے رسولؐ کا نواسہ ہے جسے امت نے اس طرح ستایا کہ اس کا وطن بھی چھوٹ گیا ہے۔ اماں! کسی قوم نے اپنے رسول کی اولاد کو اس طرح نہیں ستایا ہے۔ اماں! اس زندگانی دنیا پر خاک ہے۔ یہ اللہ کا مقرب بندہ دریدر کی مھوکریں کھائے اور ہم لوگ اپنے گھر کو جائیں۔ یہ ناممکن ہے۔ چلیے! اس غریب الوطن کا ساتھ دیں۔

عزادارو! یہ سنکر مادر وہب اپنے فرزند کو لیے ہوئے فرزند رسولؐ الشقلیں کی خدمت میں آئی اور تیوں اسلام کے دائرے میں آگئے حسینیت نے خاموش تبلیغ کی اور وہب عبیسائیت سے نکل کر اسلام کے دامن میں

اگیا۔

اب یہ قافلہ حسین این علیؑ کے ساتھ ہے یہاں تک کہ دوسری محترم کو  
حسین واردِ سر زمین کر لیا ہوئے۔ سال تویں محترم سے پانی بند ہوا۔ تویں محترم کو  
حسین چاروں طرف سے فوجوں سے گھر گئے اور یہ قافلہ حسین کے ساتھ  
مصائب میں برادر کا شریک رہا۔ یہاں تک کہ عاشورہ کا دن آگیا اور ایک مرتبہ  
مال نے بیٹے کو بیلا کر کہا۔ میرے لال ! سنتے ہو، آج قربانیوں کا دن ہے  
آج ہر ماں اپنے نورِ نظر کو اپنے مولا پر قربان کرے گی۔ بیٹا ! الیسا نہ ہو کہ کسی  
سید اپنی کالال قربان ہو جائے اور تم زندہ رہو۔ بیٹا ! الیسا ہو گا تو محشر  
میں شہزادی زبردست کو کیا منہد دکھاؤں گی۔ جاؤ میرے لال، آقا سے اجازت  
طلب کرو اور سب سے پہلے اجازت نے کرمیدان میں جاؤ۔ بیٹا ! آج تو  
ایک ہی تمنا ہے کہ تم خون میں نہاد اور میں دیکھوں۔ تم گلا کشاو اور میں مولا کی  
بارگاہ میں سرخ رو ہو جاؤں۔ تم قتل ہو جاؤ اور میں اپنی شہزادی قاطر زبردست کو  
آواز دوں۔ شہزادی ! یہ آپ کا غلام آپ کے نورِ نظر پر قربان ہو گیا۔  
مال کا حکم ملا۔ وہیب چلے۔ امام کی خدمت میں آئے، دستِ ادب  
جوڑ کر عرض کی۔ مولا ! مجھے اماں نے بھیجا ہے۔

وہیب ! خیر تو ہے کیوں بھیجا ہے ؟

عرض کی آقا ! آپ سے اذنِ جہاد لینے کے لیے بھیجا ہے۔ آقا امیری  
مال کی تمنا ہے کہ میں اُن کی نگاہوں کے سامنے خون میں نہادوں۔ میری  
مال کی آرزو ہے کہ میں آپ کے قدموں پر سر قربان کر دوں۔ آقا ! اجازت

حسین نے سر اٹھا کر سر سے پرستیک وہب کو دیکھا۔ دل نے آواز دی، وہب یہ اپنی موت کی خبر سننے کے لیے میں ہی رہ گیا تھا ہے، یہ جوانی اور یہ مرنے کی آرزو۔ یہ شباب اور یہ موت کی طریق۔ اللہ! حسین کتنا غریب و نیکیں ہو گیا ہے کہ اس سن و سال کے جوان بھی مرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ حسین خاموش کھڑے ہیں اور وہب برابر اصرار کرتے جلتے ہیں۔ یہاں تک کہ مولا نے اجازت دی۔

وہب مسکراتے ہوئے ماں کی خدمت میں آئے۔ اور کہنے لگے: اماں! مرنے کی رضامی گئی۔ اماں! اب یہ آپ کا لال خون میں نہانے جا رہا ہے۔ آپ کی آرزوؤں کی تصویر خاک میں مٹنے جا رہی ہے۔ ماں نے بیٹے کو غدر سے دیکھا۔ اور خوش ہو کر فرمایا: جاؤ میرے لال جاؤ۔

خداحافظ۔

وہب رخصت ہو کر میدان میں آئے مصروف جہاد ہوئے۔ تھوڑی ادیر کے بعد متعدد دشمنوں کو فی النار کر کے خون میں نہا کر ماں کے سامنے آئے آواز دی۔ ”ھلُّ رَضْيَتِ عَنْتِيْ یَا امَّاَلاً“<sup>۱</sup>  
ما در گرامی! اب تو خوش ہو گیں؟

ماں نے یہ سننا اور منہج پھر لیا۔ وہب نے پھر دوبارہ سوال کیا۔ ماں نے کوئی توجہ نہ کی۔ آخر کار بیٹھنے کہا: اماں! آپ کا لال خون میں نہا کر آیا ہے اب تو رضا کی سند دیدیجیے۔

ماں نے طریق کر کہا۔ میرے لال! زندہ میدان سے واپس آیا ہے،

اور ماں کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ جا جب تک سترن سے جُدانہ ہو گایہ ماں راضی نہ ہو گی۔

وہب نے ماں کا ارشاد مُسنا اور میدان کا رُخ کیا۔ چلنے لگے تو دیکھا کہ درخیل پر زوجہ سر جھکاتے کھڑی ہے۔ گھر کے پوچھا، مومنہ؟ یہاں کیوں کھڑی ہے؟ اُس نے کہا، وارث! تم تو مر نے جا رہے ہو۔ یہ تو بتاتے جاؤ کہ اس عالم غُربت میں میرا کون ہو گا۔

ماں نے اس منظر کو دیکھ لیا۔ آواز دی بیٹا! زوجہ کے کہنے میں نہ آنا۔

وہب نے دامن چھڑکے چلنے کا ارادہ کیا۔

زوجہ نے کہا، والی! جب تک مولا کے پاس چل کے ان کے سامنے دو ایک یا توں کا وعدہ نہ کرو گے میں نہ چلنے دوں گی۔

وہب زوجہ کو لیے ہوتے آقا کی خدمت میں آئے۔ عرض کی مولا! یہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔

فرزندِ رسول نے پوچھا مومنہ؟ کیا کہنا چاہتی ہے؟

اُس نے کہا، آقا! وہب میدان میں جا رہے ہیں۔ یہ ابھی شہید ہو جائیں گے اور جنت میں چلے جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ آٹ کے سامنے وعدہ کریں کہیر سے بغیر جنت میں قدم نہ رکھیں گے۔

سردارِ حرانانِ جنت حسین نے آواز دی مومنہ! یہ وہب سے کیوں کہہ رہی ہو، اس کا ذمہ دار حسین ہے میں بچھسے وعدہ کرتا ہوں کہ وہب تیر سے بغیر جنت میں نہ جائیں گے۔

مولانا کا یہ کرم دیکھنا تھا کہ ایک مرتبہ روحجر وہب نے عرض کی، آقا! اور ایک بات آپ سے بھی کہنا ہے۔ فرزندِ رسول نے فرمایا، مونہ؟ وہ کیا؟ اُس نے کہا، آقا! وہب میدان میں جا کر شہید ہو جائیں گے اور میں ایکلی رہ جاؤں گی۔ اے عزت و ناموس کے محافظ آقا! مجھے شہزادیوں کی خدمت میں بھیج دیجئے تاکہ وارث کے بعد میرا پرده توڑہ جائے۔

عززادارو! یہ سُننا تھا کہ امام کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ دل نے آواز دی، روحجر وہب! تجھے کیا خبر؟ تو تجھتی ہے کہ سید انیوں کا پرده رہ جائے گا؟ لیکن میں عصر کا منتظر دیکھ رہا ہوں۔ جب میری شہادت کے بعد نہیوں میں آگ لگے گی اور سید انیوں کے سروں سے چادری حصینی جائیں گی۔ بیڈیوں کے کھلے بتوئے سریوں گے اور تماشا یوں کا مجمع، کوفرو شام کے بازار ہوں گے اور آلِ محمد کی درباری۔ ایک منادی آواز دیتا ہوا چلے گا۔

تماشا ہو! تماشا دیکھو، یہ آلِ محمد قیدی بناؤ کر لے جائے چاہے ہیں۔ یہ رسول اللہ کی بیٹیاں ہیں جن کے بازوں میں رستیاں بندھی ہوئی ہیں، اور یہ رسول اللہ کا لال ہے جس کے ہاتھوں میں سُتھکڑیاں، پیروں میں طیڑیاں گلے میں طوقِ خاردار پڑا ہے۔

(إِنَّا إِنْهُ وَرَأَنَا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝)

۵

آعُوذُ بِاللَّهِ مِن الشَّيْطَنِ الرَّجِيمِ  
 بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى  
 سَيِّدِ الْأَنْبِيَاٰ وَالْمُرْسَلِينَ سَيِّدِنَا وَآئِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٌ  
 وَاللَّهُ الطَّيِّبُونَ الطَّاهِرُونَ وَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى أَعْدَادِهِمْ  
 أَجْمَعِينَ : أَقَابِعُهُ فَقَدْ قَالَ اللَّهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ  
 " وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ "

ملک کائنات کا ارشاد ہے کہ میرا حبیب جس کا اسم گرامی محمد ہے یہ  
 صرف میر رسول ہے۔ اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ رسالت کیا ہے اور اس  
 معانی کیا ہیں۔ کسی انسان کے رسول ہونے کا کیا مطلب ہے اور اس کا رتبہ  
 کیا ہوتا ہے۔ ان امور کی وضاحت سے پہلے ایک نکتہ کی طرف آپ کے  
 ذہن کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن حکیم نے ان تمام  
 الْجَمِيعِ سُوَءَ مَسَائلَ كُو حلَّ كرْتَهُ صرف ایک حبلہ استعمال کیا ہے۔  
 " تَذَلَّلُتُ مِنْ قَبْلِهِ السُّلُلُ " اس کے پہلے عجی رسول

گذر چکے ہیں۔ یعنی نریہ انکھا رسول ہے اور نر اس کی زلائی رسالت ہے رسالت کیا ہے؟ یتھیں معلوم ہے۔ رسول کیسا ہوتا ہے، اس کا یتھیں تجربہ ہے۔ اب یہ بحث غلط ہے کہ اس رسول کی حیثیت کیا ہے اور اس کا کردار کیا ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ جیسے تم نے رسولوں کو دیکھا ہے ویسا ہی بلند کردار اسِ رسول کا بھی ہے۔ یہ بحث الگ ہے کہ رسولوں میں اس رسول کا مرتبہ کیا ہے اور نمائندگانِ الہی میں اس کی منزل کیا ہے لیکن یہ بہرحال سلمہ ہے کہ رسالت کے لیے جو کمالات و کرامات۔ جو عظمت جملات اور جو بلندی کردار ضروری ہے وہ سب اس رسول میں موجود ہیں۔ اگر تم نے تاریخ میں کوئی ایسا رسول دیکھا ہے جو جاہل اس دُنیا میں آیا ہو۔ کوئی ایسا رسول دیکھا ہے جس کے کردار میں کوئی کمزوری رہی ہو۔ کوئی ایسا کا تجربہ کیا ہے جو اولاد و اعزاز کی محبت میں جادہ حق اور صراطِ مستقیم سے پہنچ گیا ہو، تو اس رسول کی زندگی میں بھی ایسی کمزوریاں تلاش کرنا اور اگر تاریخ میں کسی رسول یا نبی کے کردار میں ایسی کمزوری نہیں ہے تو اس رسول کے کردار میں بھی کوئی عیب نہیں ہے۔ کردار رسالت میں عیب کا تلاش کرنا تاریخِ اسلام سے ناواقفیت اور حقائقِ قرآن سے جہالت کا نتیجہ ہے۔

حیرت ہے ان مسلمانوں پر جو آج رسولِ عظیم کے کردار میں زبردستی کمزوریاں پیدا کر رہے ہیں اور کسی نہ کسی طرح مسلسلِ عظیم کو بھی اپنی سطح پر لاملاچا ہتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ کسی نبی کی امت نے یہ طریقہ کار اختیار

نہیں کیا جو اُمّتِ اسلامیہ اختیار کر رہی ہے۔ نبی تونبی دنیا کے دوسرے رہنماؤں اور دوسرے مذاہب کے سربراہوں کی تاریخیں پڑھیں۔ آپ کو اندازہ ہو گا کہ ہر قوم کی یہ کوشش رہی ہے کہ اپنے رہنماؤں کے کردار کو بلند سے بلند تر بناتا کہ پیش کرے۔ اگر کہیں کوئی مکروہی رہ گئی ہے تو اس کا انکار کر دیا جائے یا کم از کم تاویل کر کے دنیا کو مطمئن کیا جائے کہ سربراہ قوم کے کردار میں کوئی عیب نہیں ہے۔ حد ہو گئی کہ دنیا کی دوسری قوموں نے اپنے رہنماؤں کے سلسلے میں ایسے ایسے واقعات بیان کیے ہیں جو کسی طرح عقل میں آنے والے اور قرین قیاس نہیں ہیں لیکن کسی قوم نے اظہارِ فضائل میں اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ دوسری قوم مانے گی یا نہیں، دوسرے لوگ باور کریں گے یا نہیں۔ انھوں نے اپنے رہنماؤں کو جیسا مانا یا سمجھا بلا جھجک بیان کر دیا۔

یہ قسمتی توصیر اُمّتِ اسلامیہ کا حصہ ہے کہ وہ حقیقتوں کے اعلان میں غیروں کا منہج دیکھا کرتی ہے۔ اور جہاں دوسروں کے مزاج کو برمیں ہوتے دیکھا دیں سے مذہب میں ترمیم شروع کر دی۔ الضاف سے بتائیے مذہب کے حق میں اُس سے ٹرا دشمن کون ہو سکتا ہے جو قوموں کے ذہن کو بدلتے کے بھائے مذہب ہی کو تیاہ و بریاد کر دے۔ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ مذہب کی ذمہ داری اُن افراد نے سنبھال لی جن کے پاس تنخوا و تاج اور دولت دنیا توحی لیکن علوم و کمالات کا ذخیرہ نہ تھا تنخوا و تاج سے عیش و عشرت کا سامان ہو سکتا ہے، علوم کی تھیاں نہیں

سبھائی جا سکتیں۔ یہ احسان مختاً اُلِّ حُمْر کا کہ اُنھوں نے تخت و تاج کو  
ٹھوکر مار کر بساطِ علم بچھا دی اور نازک سے نازک وقت میں مذہب کی عزت  
واپر و کا تحفظ کیا۔ یہی وجہ تو ہے کہ آج تخت و تاج کے نشانات مٹ گئے  
لیکن علومِ اُلِّ حُمْر کے آثار چاروں طرف بھرے نظر آ رہے ہیں۔

دنیا کی دوسری قوموں کو جانے دیجیے خود ان اقوامِ عالم کا جائزہ  
یقینی جنھوں نے ہر دور میں مذہب کا نام لیا ہے اور کسی نہ کسی شکل سے اپنے  
مذہبی روایات کو زندہ رکھا ہے۔ ان ساری اقوام کا جائزہ صاف آواز دے  
رہا ہے کہ مذہب کے معاملیں ان کا طرزِ عمل دو طرح کا رہا ہے بعض افراد نے  
انبیاء کو باقاعدہ اسی طرح تسلیم کیا ہے جس طرح اُنھوں نے اپنے کو پہنچنوا یا  
تھا، اور جس طرح خالیٰ کائنات نے انھیں عہدہ نبوت سے سرفراز کیا تھا  
اور کچھ لوگوں نے سرے سے نبوت کا انکار کر دیا اور صاف اعلان کر دیا۔  
تمہیں جیسے ایک انسان ہو اور پروردگار نے کوئی وحی وغیرہ نازل نہیں  
کی۔ کبھی یہ کہہ دیا کہ خدا کو وحی نازل کرنا ہوتی تو کسی بڑے آدمی پر نازل کرتا  
غربت زده لوگوں پر نہیں۔ کبھی کسی لفظ میں۔ لیکن ہر دور میں ایسی ایک قوم  
رہی ہے جس نے صاف لفظوں میں انبیا کی نبوتوں کا انکار کیا اور اس پر  
اسیان لانے کو قطعی غیر ضروری بلکہ مہمل خیال کیا ہے۔

محبھے اس بات سے بحث کرنا نہیں ہے کہ یہ لوگ اپنے خیال میں کس  
حد تک مگر اڑھے اور ان کی مگر اڑھی کے اسیاب کیا لئے۔ اتنے واضح معجزات کے  
باوجود انھیں دولت اسیان کیوں نہیں ملی اور ان کا دل نورِ یقین سے کیوں منور

نہیں ہوا اور نہ اس وقت ان افراد سے بحث کرنا ہے جو نبیوں پر ایمان لائے اور انہوں نے انبیاء کی شخصیتوں کو پہچانا۔ معجزات کا اقرار کیا عظموں کا اعتراض کیا اور صفات واضح کر دیا کہ نور ایمان سر درور میں یا صلاحیت دلوں میں متوجہ ہو سکتا ہے۔ مجھے ان حضرات کے ایمان اور اس کے درجات سے بھی بحث کرنا نہیں ہے اور نہ آج اس کا محل ہے۔

اس وقت تو صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ دورِ ادم سے آج تک انبیاء کے بارے میں دو ہی طرح کے نظریات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ مکمل اقرار یا مکمل انکار۔ سابق امتوں میں ایسا ضرور ہوا ہے کہ ایمان لانے والوں نے بھی انبیاء سے غداری کی ہے اور ان کا سامنہ چھوڑ دیا ہے۔ ان کے بارے میں غلط عقائد پھیلائے ہیں۔ لیکن کم از کم استاثہ ہوا ہے کہ تابعیت نے ان کی شدید گرفت کی ہے اور اہل عقل والاصفات نے ان پر سے اپنا اعتماد اٹھایا ہے۔ لیکن یہ قسمتی صرف امتِ اسلامیہ کا حصہ ہے کہ یہ ایمان لانے کے بعد دو حصوں میں بٹ گئی اور اپنی ترقی پسند طبیعت سے خود نبوت کا بٹوارہ شروع کر دیا۔ مجھے ان کفار و مشرکین سے کیا شکوہ ہو جھنہوں نے سرے سے نبوت کے ملنے سے انکار کر دیا، یا مسلسل عظم سے یہ سریر پکار سو گئے۔ ان کی جہالت و صنالات تو صفات واضح ہے ان کی

جہالت سے اسلام یا کردارِ یانی اسلام یعنی نہیں ہو سکتا۔  
شکوہ ان مسلمانوں سے ہے جو پتے کو اسلام اور یا یانی اسلام کا مخلص کہتے ہیں اور کچھ سپنیز کی زندگی سے اپنا اعتیار اٹھایتے ہیں۔

میری نظریں تاریخ میں آج تک کوئی ایسی قوم پیدا نہیں ہوئی جس نے پہنچ نبی کی زندگی کو دو حصوں پر قیم کیا ہے۔ ایک شریعت اور ایک سیاست ایک کا تعلق دنیا سے ہوا اور ایک کا دین سے ۔ یہ صرف اُمتِ اسلامیہ کا امتیاز ہے کہ اس نے نبی کریم ص کے کردار کو بھی پاک و پاکیزہ نہیں رہنے دیا اور کلمہ پڑھنے کے باوجود نبی کی زندگی پر اعتراض کرنے کے راستے نکال لیے ۔ کہا یہ جاتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ کی شخصیت کے دو شعبے ہیں۔ ایک آپؐ کی بشریت اور ایک آپؐ کی نبوت ۔ مالکِ کائنات نے آپؐ کو نبی حضور بنایا ہے لیکن انسان ہی کے بھیں ہیں۔ رسالت کا منصب ضرور عطا کیا ہے لیکن بشر بنانے کے بعد ۔ اس لیے آپؐ کی زندگی میں دونوں چیزوں کے آثار ہونے چاہیں۔ اگر ایک طرف رسالت و نبوت کی بلندیاں، عصمت و علم و کمال ہو، تو دوسری طرف بشریت اور انسانیت کی کمزوریاں بھی ہوئی چاہیں تغیریں کے شخصیت کے دونوں پہلو نامایاں نہ ہو سکیں گے اور زندگی نا مکمل رہ جائے گی ۔

ان دونوں پہلوؤں کی حفاظت کے لیے مسلمانوں نے یہ راستہ نکالا ہے کہ مسلمِ اعظمؐ کی زندگی کے اعمال کو دو حصوں پر بانٹ دیا جائے، کچھ کام وہ رکھے جائیں جن کا تعلق دین اور شریعت سے ہو، جیسے نماز، روزہ رج، ازکوہ اور کچھ کام وہ فرار دیے جائیں جن کا دین و شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جیسے کھانا، پینا، سونا، جاگنا صلح و جنگ وغیرہ ۔ نماز، روزہ صرف اہلِ دین و شریعت کیا کرتے ہیں لیکن کھانے پینے میں

تو دین دار اور بے دین برادری کے حصہ وار ہیں۔ اسے دین کا مسئلہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔

زندگی کے اعمال کی اس تقسیم کے بعد دوسرا مرحلہ بالکل آسان ہو جاتا ہے جن اعمال کا تعلق دین و شریعت سے ہے ان میں رسول کو نبی و رسول تسلیم کر کے ان کی ہر بات کو مان لیا جائے اور جن چیزوں کا تعلق دنیاداری سے ہے ان میں آپ کو ایک عام انسان سمجھا جائے اور آپ کے احکام و تعلیمات پر خود غور کیا جائے اس لیے کہ جس طرح اللہ نے انھیں عقل دی ہے ولیسے ہی ہمیں بھی اس جو ہر سے نوازا ہے۔ جیسے فیصلہ کرنے کی وقت ان میں ہے ولیسے ہم میں بھی ہے۔ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اپنی عقولوں کو معطل اور بیکار بنانا کہ ہر بات میں انھیں کے قول پر اعتماد کر لیں اور وہ جس طرح چاہیں ہمیں اپنی مرضی کے راستے پر چلائیں۔

ہم نے کلمہ ضرور پڑھا ہے، رسالت و نبوت کی گواہی ضرور دی ہے۔ انھیں اللہ کا رسول ضرور مانا ہے لیکن ان تمام بالوں کا تعلق دین و شریعت سے ہے۔ دنیاوی زندگی کے مسائل میں انھیں رسول و بنی نہیں مانا ہے اور نہ ان کی بشریت کا کلمہ پڑھا ہے۔

ہم سے یہ مطالبہ کرنا کہ ہم دنیاوی مسائل میں بھی ان کی تقلید کریں قطعی غلط ہے۔ ایسا ہی ہوتا تو پورا دگار عالم ہمیں عقل نہ دیتا اور ساری عقل ایک سفیر کے حوالے کر دیتا۔ عقل دینے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم کچھ کام اپنی عقل سے کریں اور کچھ کاموں میں دین و عقیدے کے رشتے سے بھی یا

رسول پر اعتماد کریں۔

اربابِ کرم! یہ ہے آج کی دنیا نے اسلام کا فلسفہ، اور یہ ہے وہ سعادتمند امت جو پنے نبی کے اتباع سے جان بچانے کے لیے طرح طرح کے بھانے تلاش کر رہی ہے مسلمان کا مقصد صرف یہ ہے کہ جہاں رسول اسلام کا اتباع اپنے مزاج پر گراں ہوا اور اسلام کی تعلیم اپنی طبیعت کے خلاف ہو وہاں بشریت و رسالت کا جھگڑا اُسٹھا کر اپنی رائے پر عمل کر دیا جائے اور مسلمانوں کے فرمان کو ٹھکردا دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے صلح و حنگ کو شریعت سے نکال کر سیاست کے حصہ میں ڈال دیا ہے اور اسے رسول اکرمؐ کی رائے کا تابع نہیں مانا۔ اس لیے کہ یہی جگہ وہ ہے جہاں جان کی بازی لگانا پڑتی ہے۔ مال غنیمت کے امکان کے باوجود تواریخ میں رکھنا پڑتی ہے۔ اور یہ باتیں ہر انسان کا مزاج نہیں بروایت کر سکتا۔

اسلامی قانون کا مرطابہ صاف بتا رہا ہے کہ صلح و حنگ کا تعلق حکومت و اقتدار اور تخت و تاج سے نہیں ہے۔ صلح و حنگ اسلام کی حفاظت اور قانونِ الہی کی برتری کے تحفظ کے لیے ہوتی ہے اس کا تامین تعلق شریعت و مذہب سے ہے۔ سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو صلح و حنگ کی ذمہ داری نماز اور روزہ سے بھی زیادہ ہے نماز، روزہ انسان کا ذاتی عمل ہے۔ اس کے بغیر جانے سے انسان کے گنہوں کا ہوجانے کا اندازہ ہے لیکن صلح و حنگ کا تعلق کسی انسان کے ذاتی اور انفرادی عمل سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا یہ راست ربط مذہب اور

اس کی حفاظت سے ہے۔ اس کے غلط ہو جانے میں بیجا خون بہانے اور اسلام کے سفاک و خوزیر کہنے جانے کا خطرہ ہے اور ظاہر ہے کہ الفرادی خطرہ اتنا اہم نہیں ہوتا جتنا اہم وہ خطرہ ہوتا ہے جہاں مذہب پر آخنے لگے۔ اور ناحق خون بہائے جانے لگیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ عرب اپنی پرانی فطرت اور خلائق طبیعت سے مجبور تھے، انہوں نے کلمہ توڑھ لیا تھا، اسلام کے دامن میں پناہ تو نہیں لی تھی لیکن ان کے دل و دماغ میں صحیح طریقہ سے مذہب نہیں اترا تھا۔ ان کا منشار یہ تھا کہ اسلام لانے کے باوجود اپنے نفس کی تسلیکین کا سامان فراہم ہے اور جب مال غنیمت کی خواہش بیدار ہو میدان جنگ میں کوڈ ٹرپیں، اور جہاں زندگی خطرے میں نظر آنے لگے صلح وہ صالحت کی بات چیز شروع کر دیں۔

اسلام یہی مزاج کو بدلنا چاہتا تھا اور اس کا یہی مقصد تھا کہ میرے دائرے میں قدم رکھنے والے انسان عام النسلوں سے الگ ہو جائیں اور ان کے دل و دماغ ایک نئے سانچے میں ڈھال دیجے جائیں۔ اسی لیے اس نے واضح لفظوں میں اعلان کر دیا کہ میرے رسولؐ کی زندگی کو دو حصوں پر بانٹنا مجھ سے غداری ہے۔

وَقَامَ حَمْدًا لِّلَّٰهِ رَسُولٌ

میرا سفیہؓ (حمد) صرف پیغمبر ہے۔ اس کا ہر عمل رسالت کا عمل ہے اور اس کی ہر ادا نبوت کی ادا ہے۔ وہ بولتا ہے تو وحی خدا سے بولتا ہے

ہاتھ اٹھاتا ہے تو اشارہ خداوندی کے بعد اٹھاتا ہے۔ حدیہ ہے کہ اس کی مشیت بھی مشیتِ الٰہی کی پابند ہے۔

**وَقَاتَشَا فُرْتَ إِلَّا نُّيَشَأَ إِلَهٌ**

قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جہاں رسولؐ کی زندگی کو دو حصوں پر تقسیم کیا گیا ہوا اور اس میں نبوت و لیشریت کا فرق قائم کیا گیا ہو رہا ہے صرف مسلمانوں کے ذمہن کی پیداوار ہے جو ہر دو مری مختلف سکلوں میں سامنے آتی رہی ہے اور جس کا مقصد تو ہے، رسالت کے سوا کچھ نہیں ہے حیرت تو یہ ہے کہ کل مسلمانوں نے قرآن کو کافی کہا تھا اور آج اسی قرآن سے روگردانی کی جا رہی ہے۔ گویا یہ ایک خاموش اقرار ہے کہ ہمیں جب بھی کسی نمائندہِ الٰہی کی پیروی کا حکم دیا جاتا ہے تو ہم کسی نہ کسی بہانے بیچ نہکتے ہیں۔ لیکن یاد رکھیے کہ اسلام اخلاصِ عمل کا نام ہے، عیاریوں اور مکاریوں کا نہیں۔ عیار و مکار سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن واقعی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ مذہب و شریعت اور منصبِ الٰہی پر مکمل اعتماد کا نقشہ دیکھنا ہو تو کربلا کے میدان میں آئیے جہاں ایک ایک بچہ منصب کی عناءت سے یا خبراً اور ایک ایک خالوں قانونِ الٰہی پر مکمل اعتماد رکھنے والی ہے کیا دنیا اس حقیقت کو بھلا دے گی کہ ایک ماں یا ایک باپ کے دل میں اولاد کی کتنی محبت ہوتی ہے اور دنیا عزیز ہوں پر ہر دولت قربان کر سکتی ہے لیکن اولاد نہیں۔ یہ صرف کربلا والے تھے جہاں سہ ماں اپنی اولاد کو قربان کرنے کے لیے بے چین تھی اور سی ایک ذمہن میں بھی یہ خیال نہیں آیا کہ جنگ کے معامل

میں کسی کی پیر وی فرض نہیں ہے وہاں سہرا سن کو اپنی رائے پر عمل کرنا چاہیے اور حتیٰ الامکان جان بچانے کی کوشش کرنا چاہیے۔

خدا جانتا ہے اس حوصلے کے باپ اور اس حوصلے کی ماں کسی تاریخ میں نہیں ملتی جس حوصلے وہت کے ماں باپ کر بلا کے میدان میں نظر آتے ہیں کوئی باپ اپنے بیٹے کو میدان میں بھیج دے رہا ہے کوئی ماں اپنی اولاد کو خون میں ڈوبایا ہوا دیکھنا چاہتی ہے۔

کوئی زوجہ راہِ خدا میں اپنا سہاگ اُجر جانے ہی سے خوش ہے کیا تاریخ مسلم میں عوسمجہ کی زوجہ کے کردار کو نظر انداز کر دے گی۔ وہ خاتون جو جذبہ خدمت دین میں شوہر کی بہسر اور محبت میں سرشار تھی جس کی نگاہ میں عاشور کے دن اپنے گھر کا برباد ہو جانا ہی ضروری تھا جس کے حوصلہ کا یہ عالم تھا کہ غربت و مسافت کے عالم میں شوہر کو مرنے کے لیے بھیج دیا اور اپنی تباہی کا ذرہ برابر خیال نہ کیا۔

شوہر بھی کیسا شوہر۔ زوجہ کے جذبات کا قدر داں جسین کاغلام عوسمجہ کا لال اور صحیح معنوں میں مسلم، امام سے اذنِ جہاد لیکر میدان میں آئے تاحدِ امر کان جنگ کی اور حبِ زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے گرنے لگے تو امام کو آواز دی۔ مولا آئیے! غلام کی خبر لیجئے۔ آقا! چلہنے والا دنیا سے رخصت ہو رہا ہے اب آجائیے۔ فرزند رسول!

جلدی تشریف لائیے۔ ایسا نہ ہو کہ غلام دم توڑ دے اور وقت آخر اپ کی زیارت بھی نہ سو سکے۔

حسین کے کالوں میں آواز آئی۔ تیری سے اٹھے۔ میدان کا رُخ کیا۔  
 حبیب کو ساتھ لیا۔ دوڑتے ہوئے مسلم کے سر مانے پھوپھے۔ چاہنے  
 والے کو نزع کے عالم میں دیکھا۔ کون جانے حسین پر کیا گذگئی عجب  
 نہیں مولا کلیجہ مکٹر کر بیٹھ گئے ہوں۔ مسلم! اب تم بھی حسین کا ساتھ  
 چھوڑ دے رہے ہو۔؟ مسلم! میں اکیلار ہا جا رہا ہوں مسلم!  
 میرے چاہنے والے ایک ایک کر کے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

غلام نے آقا کے دردِ دل کا احساس کیا۔ مولا سے تنظر چار کرتے  
 تو کیونکر۔؟ حسرت سے حبیب کی طرف دیکھا۔ حبیب مقصد سمجھے۔  
 کہنے لگے مسلم! غالباً تم کوئی وصیت کرنا چاہتے ہو۔؟

مسلم نے حبیب کے چہرے پر نظر ڈالی۔ جذبات کا طوفان دیکھا  
 اور وہی آواز سے کہا۔ حبیب! کیا وصیت کروں؟ اب تم بھی میرے  
 ہی پاس آ رہے ہو۔ حبیب نے مسلم کے جذبات کا اندازہ کیا۔ سہارا  
 دیتے ہوئے فرمایا۔ مسلم! یہ صحیح ہے کہ اب زندگی کا کوئی رطف نہیں  
 ہے۔ یہ زندگی کس کام کی۔ کہ نبی زادہ نرغہ اعدام میں گھرا رہے اور مholm لوگ  
 زندہ رہیں۔ لیکن اے مسلم! یقین کرو۔ اگر تم کوئی وصیت کر دے گے تو  
 مرتے دم تک اس پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔

مسلم کا ترپتیا ہو ادل ٹھہر انس رُگی۔ ایک مرتبہ حسرت و  
 یاس سے مولا کے چہرہ پر نظر ڈالی اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز سے فرمایا۔  
 حبیب! اور کوئی وصیت نہیں ہے۔ زوجہ کے بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے۔

کمن بچے کا کوئی خیال نہیں ہے لیس صرف ایک تمنا ہے۔ دیکھو! جب تک زندہ رہنا مولا پر آنحضرت آنے دینا۔ حبیب کی آنکھوں میں آنسو آنحضرت مولا، غلام کا حیندیرہ والا دیکھ کر رو دیے۔ اللہ! الیے باوفا سماحت کے ملیں گے۔ یہ میرا اوفادار ہے جو وقت آخر بھی میری غربت و بیکسی پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

تاریخ بول سکتی تو بولتی۔ موڑخ کے پہلو میں دل ہوتا لوجذبات کی ترجیانی کرتا۔ عقیدت کے سوا کون ہے جو حسین کی حالت بتاسکے اور محبت کے علاوہ کون ہے جو آقا کے حالات کی ترجیانی کرسکے۔

مولانا کلیجہ تحصیلی میٹھے ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ حکم قضا نافذ ہوا ملک الموت اپنے فرض سے سبکدوش ہوئے اور غلام دادِ قادر یکروز نیا سے رُخصدت ہو گیا۔ غلام کا سر۔ آقا کا زالو۔ میں نہیں جانتا کہ حسین نے اپنے زالو سے مسلم کا سر کیسے ہٹایا ہو گا۔ اور مقتل میں غلام کو چھپوڑ کر کیونکر والیس چھے ہوں گے، میکن مقائل سے اتنا ضرر و معلوم ہوتا ہے کہ حبیب فرزند رسول نے خیر کا رُخ کیا تو ابھی چند قدم بھی نہ چلتے پائے تھے کہ خیر گاہ سے ایک کمن بچہ کو نکلتا ہوا دیکھا۔ سر پر چھوٹا سا عمامہ، دوش پر نیچی سی زردہ، کمر سے تلوار لگاتے ہوئے۔ کمسنی کا یہ عالم کہ تلوار زمین پر خط دی جاتی ہے، تیزی سے میدان کی طرف دوستا ہوا جا رہا ہے۔

فرزندِ رسول نے دیکھتے ہی آواز دی۔ حبیب! یہ کس کا بچہ ہے، اور خیر کا گاہ سے نکل کر دھر جا رہا ہے؟ ذرا سے رو کو۔ دیکھو تو میدان ہیں

تیروں کی بارش ہو رہی ہے۔ اشقياء ہر طرف آمادہ قتل کھڑے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس معصوم کا پچین خاک میں مل جائے۔

حبیب نے بڑھ کے بچے کو روکا۔ بچے نے لاکھ کوشش کی، لیکن حبیب اسے لیکر خدمتِ امام میں حاضر ہوئے۔ امام نے فرطِ محبت سے بچے کو گلے سے لگایا۔ چہرے سے مسمی کے آثار نمایاں، تیور لوں پریل، دل میں نصرتِ امام کا جذبہ۔ فرمایا، میرے لال! توکس کا فرزند ہے؟ اور کہاں جا رہا ہے؟ بیٹا! اس میدانِ بلاتش تیرا کیا کام ہے۔

عرض کی مولا! میں سلم بن عوسمی کا فرزند ہوں۔ اب میدان میں آپ کے قدموں پر سرشار کرنے جا رہا ہوں۔ دیر سے میرے بابا کی خبر بھی نہیں آئی ہے۔ خدا جانے میرے باپ پر کیا گذرگئی۔

امام علیؑ نے فرمایا، میرے لال! پیٹ جا۔ ایسا نہ ہو کہ تیرا گھر سے نکلتا تیری ماں کے دل پر شاق ہو؟

یہ سُننا تھا، بچے نے درستِ ادب جوڑ کر عرض کیا۔ مولا! یہ آپ کیا فرمادے ہیں۔ آقا! یہ تلوارِ کمر سے کس نے لگائی ہے۔ یہ عمameh سر پر کس نے باندھا ہے۔ یہ زردِ جھجے کس نے پنچائی ہے؟

امام علیؑ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اللہ، یہ مریعِ غربت و بیکسی کہ اب عورتیں اپنی گود کے پالوں کو لیوں سمجھا کر میدان میں چیخ رہی ہیں۔ آنسوؤں کو روک کر فرمایا، بیٹا جاؤ، والیس جاؤ۔ میرے لال میں تیرے باپ کے سر رہانے سے والیس آرہا ہوں۔ بیٹا! تیر باپ راہِ خدا میں

کام آگیا۔ تیری ماں کے لیے یہی عمر کیا کم ہے۔ اب اسے اپنا غم نہ دے۔  
کمن بچے نے مولا کی گفتگو سن کر کلیچے بکڑ لیا۔ ایک طرف یتھی کاغم۔  
دوسری طرف اذنِ جہاد نہ ملنے کا صدمہ۔ اللہ! کیا میر امقدار ایسا ہی  
ہے کہ نہ سر پر بایپ کا سایر رہ گیا، نہ مولا کی طرف سے یہ اجازت ملی کہ اپنا  
سر کٹا کر راہِ خدا میں سر بلند ہوں اور اپنی ماں کا دل خوش کروں۔

بچہ اسی کشمکش میں مختا۔ زبان پر الفاظ نہیں آرہے تھے کہ اپنے  
درد دل کا اظہار کرے۔ آنے والی سانس بھی رُک کر آری تھی ہر منزل  
پر احساسِ شیمی اور حسرتِ جہاد دل توڑے دے رہی تھی کہ ایک مرتبہ مقدر نے  
یاد ری کی اور لیپ پر دفعہ سے ایک نحیف آواز آئی۔

مولا! ایک بیوہ کا ہریہ ہے ردن کیجیے گا، آقا! اسے اپنے  
اصغر کافر یہ سمجھیے۔ آقا! یہ میری آخری تمنا ہے، اسے پا مال نہ ہونے  
دیجیے۔ اے فاطمہ کے لال! اس کنیز کی محنت سوارت ہو جانے دیجیے۔  
میں اپنی آنکھوں سے اپنے لال کو خون میں نہایا ہوادیکھ لوں۔

مولانے دل کو سنبھالا۔ انسوؤں کے سیداب کو روکا۔ بچہ کو اجازت  
دی، خدا جانتا ہے کہ حتیں نے کس دل سے اجازت دی ہوگی اور مولکے  
دل پر کیا گذر گئی ہوگی۔ میدان میں مسلم کا لال لیپ پر دہ مسلم کی بیوہ۔ ماں  
بیٹے کی آخری خبر کا انتظار کر رہی ہے۔

ایک مرتبہ سیکسی نے آواز دی۔ بیوہ مسلم! تیری گودا جڑگئی۔ تیری  
آرزو پوری ہو گئی۔ تیری گود کا پالا میدان میں کام آگیا۔ مولا تیرے لال کی

میتے کرائے ہیں۔

میں نہیں جانتا کہ زوجہ مسلم نے آنسو بھائے یا شکر کا سیدہ کیا۔  
ہاں فضایں یہ تاثیر ضرورہ کجئی کہ آج ہماری ماں بہنیں سرپیٹ پریٹ  
کر سدم کے لال کا ماتم کر رہی ہیں، اور سہر دل آواز دے رہا ہے کاشش ہم  
بھی کریلا کے میدان میں ہوتے تو اپنی گود کے پالوں کو زہر اکے لال پر قربان  
کر دیتے۔

”إِنَّا إِلَهُ وَإِنَّا إِلَيْهِ وَرَاجِعُونَ ۝“

---

۶

آعُوذُ بِإِلَهٍ مِّنَ الشَّيْطَنِ الرَّجِيمِ  
 بِسْمِ رَبِّ الْرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى  
 سَيِّدِنَا وَآلِيِّنَا وَمُرْسَلِينَ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا إِلَيْهِ الْقَاءِ  
 مُحَمَّدٌ وَإِلَيْهِ الطَّيِّبُينَ الطَّاهِرُينَ وَالْعَنَّةُ الدَّاعِيةُ  
 عَلَى أَعْدَادِهِمْ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ ۝ أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ  
 اللَّهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ ۝  
 ۝ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۝

ارشاد رب العزت ہوتا ہے۔ یہ محمد صرن میر رسول ہے۔ اسے  
 پہچانتا ہے تو صرن رسالت کے ذریعہ پہچانو۔ رسالت سے ہٹ کر اس کی  
 زندگی میں کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جو اس کا مکمل تعارف کراسکے اور اس کی  
 بلند ترین سہی کی نشاندہی کر سکے، یہ رسالت ہی ہے جس نے اس کے حل کمالات  
 کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے اور اتنی عظمت پیدا کر لی ہے کہ مالک کائنات

نے اپنے جبیب کے تعارف میں اس کے علاوہ کسی صفت کا ذکر نہیں کیا۔  
 مالکِ کائنات کے جتنے نمائندے اس کائنات کی بہادیت اور اس  
 دنیا کے انسانیت کو صراطِ مستقیم پر لگانے کے لیے آئے۔ انھیں رب العزیز  
 نے مختلف القاب اور خطابات سے یاد کیا ہے کسی کو خلیفہ کہہ کے یاد  
 کیا ہے کسی کو لفظ نبی سے تعبیر کیا ہے۔ کسی کو رسول کہہ کے رکارا ہے  
 کسی کو امام بنایا ہے کسی کو ولی اور اولی الامر کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔  
 ہے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ الفاظ مختلف موقع پر الگ الگ شخصیتوں کے  
 لیے استعمال ہوئے ہیں یا ایک ہی شخصیت کے لیے مختلف حالات اور  
 موقع کے اعتبار سے استعمال ہوئے ہیں۔ تو ان کے درمیان کوئی نہ کوئی  
 فرق ضرور ہوگا۔ اور ان کے معانی میں ایسی نزاکتیں ہوں گی جن کی پیشہ پر  
 رسول کے موقع پر نبی نہیں کہا گیا اور نبی کے موقع پر لفظ امام سے یاد نہیں  
 کیا گیا۔

ضرورت ہے کہ ہم قرآن حکیم اور بیانِ رسولؐ کی روشنی میں تلاش  
 کریں کہ آخر ان الفاظ کا منشاء کیا ہے اور انھیں حالات و مقامات کے  
 اعتبار سے الگ الگ کیوں استعمال کیا گیا ہے۔

مذہب کی زبان میں تحقیق کرنے سے پہلے ایک نظر عرب کی زبان پڑانا  
 ہوگی، جہاں سے یہ الفاظ قرآنِ کریم یا بیانِ رسولؐ میں داخل ہوئے ہیں۔  
 اس لیے کہ عربی زبان بنیادی طور پر عرب ہی کی زبان ہے۔ خالق کائنات  
 یا قرآنِ کریم کی ایجاد کی ہوئی نہیں ہے۔ قرآن مجید تو عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے۔

جیسا کہ اس نے خود اعلان کیا۔ ”إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَجَلَ بِيًّا“  
ہم نے یہ قرآن عربی انداز میں نازل کیا ہے۔

ایسے حالات میں قرآن حکیم کے معانی و مطالب سمجھنے کے لیے عربی زبان کا سہارا لینا بھی ضروری ہے۔ زبان ہمیشہ اہل زبان ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ محاورات کی خصوصیت زبان والے ہی پہچانتا کرتے ہیں غیر زبان والا کسی زبان کے محاورات کا فیصلہ نہیں کر سکتا اور نہ اسے دوسری زبان کے معاملات میں دخل دینے کا حق ہے۔

زبان کا مستند قوم و ملت کے مزاج طرز زندگی اور افتاد طبع سے منتعل ہوتا ہے۔ اسے عقل و منطق سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ اس کے مسائل فلسفہ کے اصول سے حل کر لیے جائیں۔ اہل زبان نے ایک لفظ کے لیے ایک معنی قرار دیدیے ہیں تو صبح قیامت وہی معنی رہیں گے چاہے دنیا کے تمام اہل عقل کو اس سے اختلاف ہو اور وہ اس معنی کو پسند نہ کریں۔ یہ ممکن ہے کہ اہل عقل اسی لفظ کو دوبارہ کسی اور معنی کے لیے بنالیں۔ لیکن یہ ان کی ذاتی اصطلاح ہوگی۔ اس سے زبان کے اصلی معنی پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔

زبان کا مستند انسانی زندگی میں بالعلوم اور آج کی دنیا میں بالخصوص ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ سائنسات کے ماہرین مسلسل تحقیقیں میں مصروف ہیں۔ ملکوں میں اس مستند پر فسادات ہو رہے ہیں۔ دنیلے انسانیت کا خون از زبان ہو رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا ترقی کی اس منزل پر پوچھ گئی ہے جہاں زبان کے مسائل اسلحوں سے حل کیے جائیں گے اور لفظوں کے

استعمال کے لیے سینوں کا استعمال کیا جائے گا۔ حرمت ہے کہ یہ دنیا کھر جا رہی ہے اور اس کی عقل پر کتنے پردے پڑے جا رہے ہیں۔ مجھے تو ایسا نظر آ رہا ہے کہ اس دور کی زندگی میں پردے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ عقول پر جہالت کا پردہ، خیالات پر سیاست کا پردہ، شخصیت پر مکاری کا پردہ، جہالت پر علم کا پردہ، کمزوری پر تکبیر و غور کا پردہ، چلتی پھرتی میتوں پر زندگی کا پردہ اور اتنے شدید پردوں کے بعد کبھی نہیں ہے تو عورتوں کا پردہ، اور شاید یہ سب نتیجہ ہے اسی ایک پردہ کے نہ ہونے کا۔ کہ انسانی زندگی روز بروز پردوں میں چلی جا رہی ہے اور کوئی حقیقت کھُل کر سامنے نہیں آ رہی ہے۔

چھوڑتے ہے فی الحال ان بحثوں میں نہیں الجھنا ہے۔ اس وقت تواریخ کرم کے الفاظ کے معانی طرک رکھنے ہے اور اس کے لیے عربی لغت کا سہارا لینا ہے۔ قرآن حکیم کی عظیم احتیاط تھی کہ اس نے زبان کے معاملات میں عرب کے جذبات کی قدر کی ہے اور ان کے الفاظ کو جدید معانی نہیں پہنائے ورنہ عرب کی متعصب دنیا میں ایک القاب برپا ہو جاتا اور کوئی قرآن حکیم کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا کبھی گوارانہ کرتا۔ یہ احتیاط اس منزل تک پہنچی کہ قرآن حکیم نے اپنے کو انہیں کی زبان کا معجزہ بنادیا اور انہیں واضح لفظوں میں یہ باور کر دیا کہ یہ بات تمہارے لیے باعثِ فخر ہے کہ تمہاری زبان میں ایک ایسا بلند کلام تھی پایا جاتا ہے جس کا جواب پوری دنیا میں انسانیت کے پاس نہیں ہے۔ عرب نے اس نکتہ کو پہچانا یا نہیں۔ تاریخ اس سلسلے میں واضح

بیان دیتے ہے سے قاصر ہے لیکن آج عرب حمالک کے بیانات کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اب دنیا کی انکھیں کھل رہی ہیں اور عرب اسی ایک بات پر نازل نظر آ رہا ہے ہیں کہ قرآن ہماری زبان میں نازل ہوا ہے اور ہماری زبان میں ایک ایسا بھی کلام ہے جس کا جواب کسی زبان والے کے پاس نہیں ہے۔ قرآن حکیم کے لیے ایک دشواری ضرور تھی۔ کہ عرب نے اپنے الفاظ کے جو معانی تلاش کیے تھے اور جن مطالب کو ادا کرنے کے لیے افاظ تراشے تھے وہ سب محسوس اور مادی تھے۔ عالم احساس سے محاوراء — اور ارواح و عقول کی منزل تک ان کے دماغوں کی رسائی نہ تھی۔ توحید و قیامت جیسے غیر محسوس سائل اُن کی زندگی میں داخل نہ ہوتے تھے، اور انھیں ان کا تصور بھی نہ تھا۔ اور قرآن حکیم کو ایسے ہی افکار و عقائد کو دنیا کے حوالے کرنا تھا۔

طاهر ہے کہ عربی کے افاظ استعمال کرنے کا ایک عظیم فقصان یہ تھا کہ اس طرح لوگ افاظ کے وہی صحیح سمجھتے جو ان کی زبان میں راجح تھے — وہ لفظ ”استوئی“ سے وہی نشست کا اندازہ سمجھتے جو ان کے سماج میں راجح تھا۔ ”پُلُّ اللَّهِ“ سے وہی باختمار دیتے جو ان کے بدن کا ایک جُزر تھا ”کُرْسِی“ سے وہی کرسی مراد دیتے جسے اپنے گھر دیں دیکھا تھا۔ ”قلب“ سے وہی گوشت کا مکمل امراد دیتے جسے اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے تھے اور قرآن حکیم کو اس سے بالاتر فارہم و خیالات کی نشاندہی کرنا تھی۔ سخت منزل تھی اور عجیب مرحلہ تھا۔ زبان کے معانی تھی نہ بدلنے پائیں اور

محسوس مزاج والوں کو معقولات تک پہنچا دیا جائے۔ مشاہدہ کے قیدیوں کو اسرار غیب سے آشنا بنادیا جائے۔

یہ قرآن حسکیم کے متکلم کا کمال تھا کہ اس نے ایک لفظ سے سارے مسائل کو حل کر دیا اور ایک نکتہ کو ایجاد کر کے ساری دشواریوں کو آسان بنا دیا۔ اور وہ ہے لفظ "تاویل"، اس نے آوازی اس قرآن میں الفاظ کے معانی بھی ہیں اور تاویل بھی، اسے سمجھنے کے لیے اہل زبان کے بیانات سے بھی مدد لینا پڑے گی اور ہمارے افکار و نظریات سے بھی۔ تم نے صرف ان کے بیانات پر اعتماد کر لیا تو محسوسات میں گم ہو جاؤ گے اور عقائد کی بلند ترین منزلوں تک نہ پہنچ سکو گے اور صرف عقیدہ کو نے لیا تو اس کی تشریع کے لیے ہمارے بیان تک نہ پہنچ سکو گے۔ ضرورت ہے کہ عرب کے معانی کو ہمارے افکار کی روشنی میں سمجھو اور یہ اندازہ کرو کہ محسوسات کو معقولات کے ساتھ میں کیونکر ڈھالا جانا ہے۔ مشاہدات کو دیکھ کر غیب تک رسائی کیونکر ہوتی ہے۔ اب اسلامی عقائد کو سمجھنا ہے تو وہ کُرسی "کونہ دیکھو؟" اس کے علبہ و احاطہ کو دیکھو۔ ہاتھ کونہ دیکھو، اُس کی قوت اور طاقت کو دیکھو۔ قلب کونہ دیکھو، اس کے افکار و خیالات کو دیکھو، اپنا اندازِ نشست نہ دیکھو سلطانی قہر اور جبر و قی اقتدار کو دیکھو۔

قرآن کریم کا یہ وہ سلیمانیہ انہام و تفہیم تھا جسے حقیقی معنوں میں اس کا معجزہ کہا جاسکتا ہے۔ اس نے اس اندازِ بیان کو اختیار کر کے کئی فائدے حاصل کیے ہیں۔

ایک طرف عرب کے جذبات کی حمایت کی اور زبان کے معانی میں  
دخل اندازی نہیں کی اور اس طرح بغاوت کے عظیم طوفان کو روک دیا اور  
سیلاپ پر سلیپی ہی منزل میں بندھ باندھ دیا۔ دوسری طرف انھیں الفاظ  
کا سہارا لیکر دنیا کے عربیت کو اپنے عظیم اور وسیع ترین خیالات سے  
روشناس کر دیا۔

اور ان سب سے بالاتر اہل ہوا وہوس کے دماغوں پر پھرے بھاڑیے  
اور انھیں حقائقِ قرآن میں دخل اندازی کرنے سے مکمل طور پر روک دیا۔  
یاد رکھو! اگر یہ قدر آن صرف محسوسات اور مشاہدات کی دنیا سے  
متعلق ہوتا تو ہر صاحبِ زبان الفاظ کے معانی کو دیکھ کر اس کی حقیقت  
تک پہنچ جاتا، لیکن اسے کیا کرو گے کہ اس میں معقولات اور غائبات  
کا بھی ایک سلسہ ہے جسے انھیں الفاظ کے پردہ میں چھپا دیا گیا ہے اس  
کا اندازہ نہ الفاظ سے ہو گا نہ معانی سے۔ نہ زبان سے ہو گا نہ لغت  
سے۔ اس کا علم تو اسی پردہ ڈالتے والے کو ہو گا جس نے اس سلسے کو پرستی میں  
چھپایا ہے۔ اسی عالم الغیب کو ہو گا جسے غیبی اسرار کی مکمل اطلاع ہے  
اور جس کے علم سے کائنات کا کوئی ذرہ باہر نہیں۔ اسی لیے اس نے

صاف لفظوں میں اعلان کر دیا:

وَوَقَّاَيْلَمْ تَأْوِيلَهِ إِلَّا اللَّهُ وَالْإِسْخُونَ فِي الْعِلْمِ ۝

قرآن کے الفاظ کے معانی تو ہر عرب جانتا ہے اور اسی لیے اسے  
کلامِ لبشر سے بالاتر اور مجذہ تسلیم کرتا ہے لیکن اسکی تاویل، اس کی حقیقت

اور اس کے معقولات و غائبات کو یا خدا جانتا ہے یا وہ لوگ جو علم میں رسوخ رکھتے ہیں اور حضیں مالک قرآن نے علم قرآن عطا کیا ہے۔

اب پہچانا آپ نے۔ کہ قرآن اور اہلیت کا شہر کیا ہے، اور پیغمبر اکرمؐ دنیا سے جاتے جاتے قرآن کے ساتھ اہلیت کو کیوں چھوڑ گئے تھے۔ یہ ایک اشارہ ہے کہ امت تاویل قرآن - حقیقت قرآن - مقصد قرآن اور روح قرآن کا علم حاصل کرنا چاہیے تو اسے اہلیت کی ڈیورٹھی پر آنا پڑے گا۔ ” (حدیث ہے : )

” فَمَنْ أَرَادَ الْعِلْمَ فَلَيَأْتِ الْبَابَ ”

” جیسے بھی علم حاصل کرنا ہو وہ باب مدینہ علم تک آئے یہ جیسے بھی حکمت درکار ہو وہ علیؐ کی چوکھٹ پر جبیں سائی کرے۔ قرآن میں تو یہیں - اسلام میں گا تو یہیں - دین میں گا تو یہیں - احکام میں گے تو یہیں - نبوت میں گی تو اسی کھر میں - اور توحید کا سبق میں گا تو اسی درستے۔

میں یہ گذارش کر رہا تھا، الفاظ قرآن کو سمجھنے کے لیے لفظ عرب اور مزاج اسلام دونوں کا سمجھنا ضروری ہے۔ تنہائی ایک کے علم سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ آئیے اسی روشنی میں ان الفاظ کے مفہوم پر غور کیا جائے۔ عربی زبان کے اعتبار سے نبی کے معنی ہیں، خبر دینے والا۔ رسول کے معنی ہیں پیغام پہونچانے والا۔ خلیفہ کے معنی ہیں کسی کی جگہ پر آنے والا۔ اور امام کے معنی ہیں کسی کے آگے چلنے والا۔

ظاہر ہے کہ محسوسات کی دنیا میں خبر۔ پیغام جگہ اور سامنے یا سچے  
کا ایک عام نہ ہوم ہے جس کا تعلق صرف مادیات سے ہے اور مذہب کے  
خیالات اس سے کہیں زیادہ بلند نہیں ۔۔۔ یہاں خبر یا پیغام دنیا  
کے عام پیغام جیسا نہیں ہے۔ جگہ کا تصور عام مکانات کا نہیں ہے  
بلکہ عظیم عہد ہے ہیں جن کی ایک معنویت ہے اور معنوی دنیا میں قدر و  
قیمت ہے۔

خبر دینا اور پیغام پھوپھانانا ظاہر ایک ہی ہے لیکن اگر آپ غدر  
کریں گے تو دونوں میں ایک نازک ساقی معلوم ہو گا خبر دینے والے کی  
وہ ذمہ داری نہیں ہوتی جو پیغام پھوپھانے والے کی ذمہ داری ہوتی ہے  
خبر دینے والے کی ذمہ داری خبر سننا دینے کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور جسے  
پیغام دے کر بھیجا جاتا ہے اس سے یہ امید ہوتی ہے کہ وہ اس پیغام پر  
پُرسُل بھی کرے گا۔ اسی لیے شریعتِ اسلام نے نبی اور رسول کے فرق  
کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ جس نمائندہ الٰہی پر تبلیغ کی ذمہ داری  
نہیں ہوتی اُسے نبی کہتے ہیں اور جس پر تبلیغ کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے اُسے  
رسول کہتے ہیں خدا نے نبی ایک لاکھ چھوٹی میں بڑا بھیجی ہیں لیکن رسول صرف  
تین سوتیرہ ہی بنائے ہیں۔ انہیاں پانے عمل یا اپنے قول سے مرضی خدا اور  
منشاءِ الٰہی کی خبر دیا کرتے تھے اور مسلمین، امت کو علی پر آمادہ کیا کرتے تھے  
انہیاں کے پاس تبلیغی نظام کا ہوتا ہزروی نہیں تھا لیکن مسلمین اپنے ساتھ  
پورا نظام لے کر آیا کرتے تھے ۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ ایک منزل ان

دولوں سے بھی یا لاتر ہے جسے صاحبِ عزم کہا جاتا ہے۔ اس کی ذمہ داری صرف تبلیغ کی نہیں ہے، بلکہ یہ لے ہوئے حالات میں نہی شرعیت اور نئے فتاویں کو روایج دینا بھی ہے۔

ظاہر ہے کہ دوسرے کے پیغام پر عمل کی دعوت دینا اتنا مشکل کام نہیں ہے جتنا ایک نئے پیغام کو پیش کر دینا یا راجح کر دینا۔ اس منزل پر ہزاروں شبہات کا سامنا ہوتا ہے۔ سیکھوں بغاوتیں سر اٹھاتی ہیں اور ہر انسان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جب کل کی شرعیت بھی خدا ہی کی شرعیت حقیقی تواجح اسے بدلا کیوں نہیں کیا، اور اس میں انقلاب کیوں لا لایا گیا تفصیل کا وقت نہیں ہے ورنہ میں نے نظام کے راجح کرنے کی دشواریاں اور عوام کے جذبات بغاوت کا تجربہ کر کے بتاتا کہ یہ کام کتنا بڑا حوصلہ اور کتنا پختہ عزم چاہتا ہے۔ شاید یہی وجہ حقیقی کہ جن کے حوالے اتنا اہم کام کیا گیا تھا انھیں رب العالمین نے اول العزم کہیہ کے یاد کیا ہے۔ یہ وہ یا ہمت افراد تھے جن کے عزم کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ حوصلہ منہ شخصیتیں تھیں جن کے ارادوں کے سامنے پھر انکھے طنکھے ہو جاتے تھے عزمِ نوح گواہ ہے کہ تھپر میں دب جانا ممکن ہے۔ تبلیغ کا چھوڑ دینا ممکن نہیں۔ عزم ابراہیم گواہ ہے کہ آگ میں کو دپڑنا ممکن ہے تو حیہ کا پیغام ترک کر دینا ممکن نہیں۔ عزمِ موسیٰ پکار رہا ہے کہ نیل کی موجودوں سے کھیلتا آسان ہے دینِ خدا سے کھیلنا مشکل۔ عزمِ عیسیٰ اعلان کر رہا ہے کہ ”نعم باطل میں“ تحریک دار کا سامنا آسان ہے لیکن کا رہایت کا

ترک کر دیا مشکل ۔ اور عزم سرکارِ دو عالم<sup>۲</sup> آواز دے رہا ہے کہ پتھر، آگ، پانی، سولی کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا انبیاءِ سابقین کا کام تھا اور یہاں تو حوصلوں کی دہنسنzel ہے کہ اگر ایک ہاتھ پر آفتاب رکھ دیا جائے اور دوسرا ہاتھ پر ماہِ شہاب رکھ دیا جائے تو بھی ارادوں میں فرق نہیں آسکتا اور سبیلیع کے کاموں میں رکاوٹ نہیں پیدا ہو سکتی۔ مرسلِ عظیم<sup>۳</sup> کا یہی حوصلہ اور جیب خدا کا یہی ستحکم ارادہ تھا جس پر مالک کو بھی پیارا گیا۔ اور اُس نے آواز دی ”احسنت“، میرے جیبیت۔ مرحیا میرے محجوب۔ اگر تو نہ میرے مقصد کے لیے اتنی بڑی قدر بانی کا عزم کر لیا ہے تو یہ میں بھی تجھ سے وعدہ کیے لیتا ہوں

”وَإِنَّ اللَّهَ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ“

” تو دین کی تبلیغ کرتا جائے گا اور میں تیری حفاظت کرتا جاؤں گا“ یاد رکھیے اپنے امیری کی دشواریوں ہی سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس پیغام کا تحفظ کس قدر دشوار اور کس قدر مشکل ہے۔ اس لیے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مر مقابل پیغام کی عظمت یا اس کے ملنے والوں کی طاقت کو دیکھ کر قبیح طور پر چُپ ہو جاتا ہے اور اس موقع کا انتشار کیا کرتا ہے جب یہ شیرازہ منتشر ہو جائے اور اسے دوبارہ پیغام کو مٹانے اور رسالت پر چل کرنے کا موقع مل جاتے۔ اُحد کی لڑائی اس بات کی زندہ گواہ ہے کہ باطل کبھی چین سے نہیں بیٹھا کرتا۔ اس کے ذمہ میں ہمیشہ حق کو پامال کرنے کی تدبیری رہی ہیں اور وہ اپنے موقع کا منتظر رہتا ہے ۔

یہ بات واضح ہو جائے تو ائمہ معصومین کی زحمتوں کا بھی صحیح اندازہ ہوتا ہے جہاں باطل ایک مدت تک خاموش بیٹھنے کے بعد چھ منظرِ عام پر آیا ہے اور ابوسفیان کی اولادِ محمد عربی کے فرزند سے بعیت لینا چاہتی ہے۔ یاد کیجئے یہ ریزید، حسین بن علی سے مطالبہ بعیت نہیں کر رہا ہے کفر، اسلام سے اپنا استقامہ رہا ہے۔ باطل، حق سے اعلانِ جنگ کر رہا ہے۔ وقتی خاموشی شور طوفان سے بدل رہی ہے اور وقت آگیا ہے کوئی مرد مجاہد اٹھ کر راست کی حفاظت کرے اور ریزید پر واضح کر دے کہ تو نے محمد عربی کے عزم کو نہیں دیکھا — میں محمد کے نواسے کا عزم دیکھے — اگر دین کی حفاظت کے لیے مجھے سرخی دینا پڑے گا تو سردے دوں گا لیکن عزتِ دین کو برداش نہیں ہونے دوں گا۔

دین و شرائع کے تحفظ کا یہی عزم تھا جس نے حسین بن علی کو ایک خاص طرز کے اصحاب کو جمع کرنے پر جبوہ کر دیا تھا۔ حسین جانتے تھے کہ میں نانا کی طرح بیشمار اصحاب اور بابا کی طرح بکثرت انصار جمع کر سکتا ہوں۔ اہلِ دنیا میرے ساتھ ہی آنے کے لیے بچیں ہیں لیکن آپ ہر قدم پر واضح کر دینا چاہتے تھے کہ اب دین کو اصحاب و انصار کی ضرورت نہیں ہے۔ اب لشکر و فوج کی منزلیں گذر چکی ہیں۔ اب سرکٹانے والے جاں شار اور تلواروں کی دھاروں پر چلنے والے مجاہدین کی ضرورت ہے۔ اسی لیے آپ نے قدم پر ساتھیوں کو آواز دی کہ جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ اس راہ میں مصائب کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہاں سرکٹانے کا مرحلہ اور گھر لٹانے کی منزل ہے۔

خدا جانتا ہے کہ اس عزم کا سردارِ شکر آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔  
 دنیا کے سردارانِ شکر وقتِ آخر تک فوجوں کو کامیابی کا یقین دلاتے رہتے  
 ہیں اور اُن نے والوں کو یہی سمجھاتے رہتے ہیں کہ آخری فتح ہماری سے کامیابی  
 ہمارے ہی قدم چومنے کی۔ تخت و تاج ہمارے ہی قدموں میں رہیں گے لیکن  
 ہمیں ہر ہر قدم پر یہ واضح کرتے جلتے تھے کہ جانما ہے تو چلے جاؤ۔  
 یہاں نہ تخت ہے نہ تاج۔ نہ حکومت ہے نہ اقتدار۔ نہ مال  
 غنیمت ہے نہ آب و دارہ۔

خدا جانے وہ کیسے حوصلہ مندا اور بادنا صاحب تھے جو ایسے حالات  
 میں بھی امام حسین علیہ السلام کے قدموں سے لپٹے رہے۔ اور ایک لمحہ کے  
 لیے فرزندِ رسولؐ کو چھوڑنا گوارہ نہیں کیا۔ موت آتی ہے تو آجائے گلے کٹتے  
 ہیں تو کٹ جائیں۔ گھر لٹتا ہے تو لٹ جائے لیکن فرزندِ رسولؐ کا ساتھ  
 نہیں چھوٹے گا جیرت ان پر نہیں ہے جو حسین کے ساتھ تھے اور ایسے حالات  
 میں رہ گئے جیرت اُن کی وفا پر ہے جو اپنے گھر میں چین سے بیٹھے ہوئے تھے  
 اور ان حالات کی خبر سننے ہی کربلا کے لئے روانہ ہو گئے۔

کیا تاریخ اس واقعہ کو بھلا دے گی کہ جبیں ابنِ مظاہر اپنی زوجہ  
 کے ساتھ بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے کتنا یُسکون ماحول تھا اور  
 کتنے اطمینانی حالات کے ایک مرتبے کسی نے دقّ الیاب کیا۔ جبیں نے  
 گھر اکروچھا کون؟ آنے والے نے کہا۔ ”آنَا بَرِيْدُ الْحُسَيْن“، میں  
 حسین کا قاصد ہوں۔ حسین کا نام سُنا، دستِ خوان چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

ارے، میرے آقا کا نامہ برآیا ہے۔ میرے شہزادے کا خط لایا ہے۔ میرے مولانے مجھے یاد کیا ہے۔ دوڑ کر دروازہ پر آتے۔ دروازہ گھول افڑ جب ت سے لفافہ کو لیکر چاک کیا۔ دیکھا لکھا ہوا ہے:

”یخڑ حسین بن علیؑ کا ہے ایک مرد فقیرہ جبیب بن مظاہر کے نام۔ اے جبیب! ہم دشمنوں میں گھر گئے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم ہماری مرد کو آؤ؟“ خطف پڑھا۔ دل تڑپ گیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اللہ، رسولؐ کا نواسہ اور ترغیث اعداء تیں۔ فاطمؓ کا لال اور دشمنوں میں۔ علیؑ کا نور نظر اور عالم غربت و مسافت تیں۔ سر جھکائے ہوتے گھر میں داخل ہوتے زوجہ نے چہرہ کی ادا سی میں خط کام مضمون پڑھا اور گھبر اکر کیا۔ جبیب! مولانے کیا لکھا ہے؟

جبیب نے بھرتائی ہوئی آواز میں کہا۔ فرزند رسولؐ ترغیث اعداء میں گھر گیا، مجھے مرد کے لیے بُلا یا ہے۔

زوجہ نے تڑپ کر لپچھا پھر کیا ارادہ ہے۔ ہے جبیب نے کہا۔ سوچ رہا ہوں کہ ان مصائب میں جاؤں یا نہ جاؤں۔

زوجہ نے کہا۔ افسوس، رسولؐ کا لواسہ بیار ہے اور تم سوچ رہے ہو۔ جبیب نے کہا۔ مومنہ! تیر اخیال بھی تو ہے کہ مجھے کس پرچھوڑ کے جاؤں گا۔

زوجہ نے نہ پیٹ لیا۔ اللہ۔ صحیح میر اخیال ہے اور فاطمؓ زہرا کا اخیال نہیں ہے۔ جبیب نے زوجہ کو تسلیکن دی۔ مومنہ میر ارجاتا بیحد ضروری بھی میں ضرور جاؤں گا۔ چاہتا تھا کہ اس راہ میں تیرے جذبات کا بھی اظہار ہو جائے۔

اچھا۔ اگر تیرا بھی یہی حوصلہ ہے تو جاتا ہوں۔ اب شاید پلٹ کرنا نقیب نہ ہو۔ زوجہ نے کمالِ محبت سے رُخصت کیا۔ جاؤ خدا کے حوالہ کیا۔ دیکھو امیرِ اخیال نہ کرنا۔ میں اپنا سہاگ لٹکنے کے لیے تیار ہو گئی۔ لبس کو شش کرنا کہ میرے مولا پر کوئی آنکھ نہ آنے پائے۔ زوجہِ حبیب کے جذبات نے نہ جانے کیا کیا کہا، اور حبیب نہ جانے کیا کیا ارادے لیکر چلے۔ مگر سے نکل کر غلام کو ملایا۔ حالاتِ زمانہ کو دیکھ کر غلام سے کہا۔ تو میرے گھوڑے کو سیکر چل اور فلاں مقام پر میرا منتظر کرنا۔ میں باغات کی طرف سے ہوتا ہوا آ رہا ہوں۔

غلام گھوڑے کو لے کر چلا اور ایک مقام پر کھڑا ہو گیا۔ ادھرِ حبیب کے آنے میں کچھ تاخیس ہو گئی۔ قریب پہنچنے تو کیا دیکھا کہ گھوڑے کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور غلام کہہ رہا ہے: اے اسپ باؤ فا! اگر میرا مالک نہ آیا تو میں تیری لیشت پر سوار ہو کر فرزندِ رسولؐ کی مدد کو جاؤں گا۔

حبیب نے کلیچے بکپڑا۔ دل نے آواز دی۔ فاطمہ کے لال! اب آپ کے مصائب اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ غلام جان قربان کرنے کے لیے تیار ہیں اور جاذا آنسو میہار ہے ہیں۔ یہ کہہ کر قریب پہنچنے والام کے ماخوس سے بجا مفرس کولیا۔ گھوڑے پر سوار ہوئے۔ غلام کی طرف رُخ کر کے آواز دی: جامیں نے تجھے راہِ خدا میں آزاد کیا۔ غلام نے قدم تھام لیے۔ آقا! یہ کیسا الصاف ہے؟ جب تک آپ کی خدمت کا معاملہ تھا، آپ نے مجھے ساتھ رکھا، اور اب جو فرزندِ رسولؐ کی خدمت کا

موقع آیا تو مجھے چھوڑ کر جائے تیں۔ یہ ہرگز نہ ہو سکے گا۔ اور میں آپ کے  
سر اہ چلوں گا۔

جبیب نے غلام کو ساتھ لیا اور تیزی کے ساتھ بڑھے، ایسا نہ  
ہو کہ پہنچنے میں تاخیل ہو جائے اور فرزند رسولؐ کی بارگاہ میں شرمندہ  
ہونا پڑے۔

منزل سے قریب پہنچنے تو دل مطمئن ہو گیا کہ مولاکی بارگاہ قریب ہے  
اور میں پانے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

ادھر کو فر کی جانب سے اڑتی ہوئی گرد کو دیکھتے ہی فرزند رسولؐ نے  
صحاب کو حکم دیا: بڑھو! بڑھو! استقبال کرو۔ میرا بچپن کا جانشناز  
جبیب آرہا ہے۔

صحاب بڑھے۔ جبیب کا استقبال کیا۔ جبیب مولاکی خستہ  
میں حاضر ہوئے۔ اب جو دیکھا تو کیا دیکھا کہ مولا زغمہ اعداء میں ہیں اور  
چاروں طرف خون کے پیاس سے ہیں۔ بچپن پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔

دل سن بھالا۔ قربانی پر تیار ہوئے۔ امام کے سکون کو دیکھ کر  
صحاب میں سستت کی لمبڑا ٹکری۔ ادھر خیم میں یہ خبر پہنچی کہ کوئی آیا ہے۔  
ثانی زہراؓ نے فضہ سے کہا۔ فضہ! دیکھو کون آیا ہے؟

فضہ دوڑ کر دخیلہ پر آئی اور پلٹ کر خبر سنائی۔ شہزادی!  
سباک ہوا آٹ کے مانچلتے کا بچپن کا ساتھی جبیب آیا ہے۔ یہ مُتنا ساتھا  
کہ زینت کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ فضہ! جلدی جا اور جا کر جبیب سے

میر اسلام کہنا۔ کہنا حبیب! تم نے بڑا احسان کیا جو الیسے وقت میں میرے  
ماں جلے کی مدد کو آگئے فضہ نے آکر شہزادی کا پیغام سنایا۔ حبیب  
تڑپ گئے۔ خاک پر بیٹھ گئے۔ منہ پر طماںخے مارنا شروع کیے۔  
اللہ، اب وہ وقت آگیا ہے کہ: دختر زہرا غلام کو سلام کہلواری ہیں، اور  
اس کا احسان مان رہی ہیں۔

عذردارو! یہ حبیب تھے جنہوں نے زینب کے سلام کی یہ قدر  
کی۔ اب ایک سلام آپ کے نام بھی ہے۔ پہچانا آپ نے کون سا  
سلام جب حسین رخصت آخر کے بعد چلنے لگے تو بیمار بیٹھے سے فرمایا۔  
میرے لال! جب قیدِ شام سے چھٹ کر مدینے جانا تو ہمارے شیعوں سے  
ہمارا سلام کہہ دینا۔ اور کہنا، شیعو! جب ٹھنڈا پانی بینا تو میری  
پیاس کو یاد کر لینا اور جب کسی غریب و شہید کا ذکر آ جائے تو مجھ پر آنسو ہیانا  
واحینا — واحینا —

روئے والو! آؤ ہم سب مل کر فرزندِ رسول<sup>ؐ</sup> کو جواب سلام دیں اور عرض  
کریں۔ آدم کے وارث! تجوہ پر سلام — نوح کے وارث تجوہ پر سلام  
— ابرہیم و اسماعیل کے وارث تجوہ پر سلام — موسیٰ<sup>ؑ</sup>  
اویسی<sup>ؑ</sup> کے وارث تجوہ پر سلام — محمد<sup>ﷺ</sup> کے لال تجوہ پر سلام  
— علی<sup>ؑ</sup> کے نور نظر تجوہ پر سلام — فاطمہ<sup>ؑ</sup> کے پارہ دل تجوہ  
پر سلام —  
سلام اُس سراط پر جو نوک نیزہ پر بلند کیا گیا۔ سلام اس

جسمِ اقدس پر جو خاکِ کربلا پر ٹپڑا رہا — سلام اُس گلوئے مبارک  
 پر جسے کُند خبیر سے کاٹا گیا — سلام اُس سینہ اطہرِ حبس پر  
 شمر نے قدم رکھے — سلام اُس لاشِ مطہر پر جسے گھوڑوں کی طاپوں  
 سے پامال کیا گیا — سلام اُن بہائے نازینیں پر جو وقتِ آخر  
 بھی خششِ امت کی دعائیں کرتے رہے۔

**إِنَّا يَلْهُ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ**

---

۷

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ  
 بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى  
 أَشْرَفِ الْأَنْبِيَا وَالْمُرْسَلِينَ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا إِلَىٰ لِقَاءِ  
 هُمَّدٍ وَالْمُطَّهِّرِينَ الطَّاهِرِينَ وَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَىٰ  
 أَعْدَائِهِمْ أَجْهَمِينَ أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللَّهُ  
 الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ  
 وَمَا مَحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ

ارشادِ جنابِ اقدسِ الہی ہے۔ ”محمر صرف اللہ کے رسول ہیں۔“  
 مالکِ کائنات نے اپنے حبیب کے تعارف میں دلفظیں استعمال کی  
 ہیں۔ ایک محمر اور ایک رسول۔ بظاہر تو یہ دلفظیں ہیں لیکن اگر غور کیا  
 جائے تو یہ آئینہ کے دو رُخ ہیں جن میں مصلِ عظم کی پوری زندگی کا مشاہدہ  
 کیا جاسکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مالکِ کائنات نے قبلِ خلقتِ آدم عالمِ بتو

سے سرفراز کرنے کے بعد اپنے حبیب کو اس دنیا میں بھیجا اور مل عظیم نے جب بھی اس دنیا میں قدم رکھا، رسالت آپ کے ساتھ ساتھ تھی۔ بعثت پیغمبر رسالت کا اعلان ہے، رسالت کی عطا نہیں ہے۔ بعثت رسالت کی عطا کیوں نہیں ہے اور اعلانِ رسالت سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے؟ ان تفصیلات کا موقع نہیں ہے۔

اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ رسالت کے اس عظیم عہدہ پر فائز ہونے کے بعد بھی حضور سرور کائنات نے جب اس دنیا میں قدم رکھا تو بشری کے چیزوں میں آئے۔ آپ کے جسمِ اقدس پر شریت ہی کالیاں زیما معلوم ہوا۔ آپ کو دنیا کے انسانیت و آدمیت ہی کی ایک فردیناکر بھیجا گیا۔ جس کے بعد آپ کی زندگی میں دو پیلوں کا پیدا ہو جانا ضروری تھا آپ بشریت تھے اور رسول بھی۔ آدمی بھی تھے اور نبی بھی۔ انسان بھی تھے اور نمائندہِ حنفی بھی۔ آدمیت کے اعتبار سے سارے انبیاء کے بعد دنیا میں تشریف لائے اور نبوت کے اعتبار سے قبلِ آدم بھی نبی تھے۔

شریت کے اعتبار سے اولادِ آدم میں شمار ہوتے تھے اور رسالت کے اعتبار سے کائنات کا ایک جزو تھے۔ اور روحانی کمالات کے اعتبار سے پوری کائنات کی روح و جان۔ اور خلق ت کون و مکان کی اصل و علت

”لَوْلَكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ“

”محمد اگر تم نہ ہوتے تو یہ کائنات نہ ہوتی“

میں نے اس کائنات میں جو کچھ پیدا کیا ہے سب تھمارے ہی صدقے میں

پیدا کیا ہے۔

یہ بشرتیت ہی تھی جو آپ کو اٹھنے بیٹھنے، سونے جانے، کھانے پینے اور چلنے پھر نے پر آمادہ کرتی تھی۔ اور آپ دنیا کے دوسرے انسانوں کی طرح زندگی بس کرتے تھے۔ روٹی، کپڑا، مکان آپ کے بھی بنیادی ضروریات میں شامل تھے۔ اور آپ نے ظاہری زندگی اس سادہ انداز سے گذاری کہ فار کو کہنے کا موقع مل گیا کہ ””ہم اسے نبی نہیں مانیں گے جو بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے اور کھانا بھی کھاتا ہے““

وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ نبوت و رسالت کھلنے پینے کی محتاج نہیں ہے لیکن انسانی زندگی کے لیے یہ چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور محمد جہاں رسول ہیں وہاں بشر بھی ہیں۔ انسان بھی ہیں اور اولادِ آدم میں بھی ہیں۔

اسی نکتہ کا الحاظ رکھتے ہوئے قرآن حکیم نے رسولِ عظیم کی رسالت کا اعلان ان لفظوں میں کیا تھا:

”هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَمِينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ“

”وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّكُلِّ الْوَالِوْنِ“ میں ایک رسول بھیجا جو اخیں میں سے تھا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ پیغمبر، رسول بھی تھا، اور اخیں میں سے تھا۔ ظاہر ہے کہ مکہ والے سب رسول نہیں تھے کہ رسول اخیں میں سے ہوتا بلکہ اس کا کھلا ہوا مقصد یہ ہے کہ ہمارا حیثیت رسول ہونے کے باوجود مکہ والوں ہی میں سے تھا۔ رسول ہونا اس کا روحانی مکال ہے اور مگر

ہونا اُس کے جسم کا تقاضا ہے۔ جب جسم رکھتا ہے تو جسمی نہ کسی مرکان میں  
رہے گا اور جب مرکان مقرر ہو جائے گا تو وطن کا رشتہ خود بخوبی پیدا ہو جائے گا۔  
اس حقیقت کے ماننے میں کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہیے کہ نبی کی  
زندگی میں دو پہلو ہیں؛ ایک بشریت اور ایک رسالت۔ ایک آدمیت  
اور ایک خاتمیت۔ لیکن قابل توجہ بات صرف یہ ہے کہ ان دونوں  
پہلوؤں کو کسی وقت بھی الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا ناممکن ہے کہ کھاتے  
پیتے وقت بشر ہی اور رسالت ختم ہو جائے۔ اور زوالِ وجہ کے وقت  
رسول ہی اور بشریت تمام ہو جائے۔ نہیں نہیں یہ زندگی کے ہر لمحہ  
میں۔ حیاتِ مادی کے ہر موڑ پر بشری بھی ہیں اور رسول بھی۔ حدیہ  
ہے کہ کسی کی تعظیم کو اٹھتے ہیں۔ کسی کو دوش پر جگہ دیتے ہیں۔ کسی  
کے لیے تاقہ بن جاتے ہیں تب بھی رسول رہتے ہیں۔ اور معراج کی  
منزلوں کو طے کرتے ہوئے قابِ قوسین اُذاذنی " کی  
منزل تک پہنچ جاتے ہیں تو بھی بشری رہتے ہیں۔

معراج جسمانی کا ازاں کار کرنے والے سدان اسی غلط فہمی میں پڑے  
رہ گئے کہ رسالت کی زندگی الگ ہوتی ہے، اور بشریت کی زندگی الگ  
اور مالک کائنات نے مادی جسم کے ساتھ عرشِ اعظم پر بلکہ یہ واضح کر دیا کہ  
ان کی زندگی میں نہ بشریت، رسالت سے الگ ہے نہ رسالت بشریت سے  
محصر ہے کہ یہ ایک ایسا رسول ہے جس کی رسالت بشریت کے  
ساتھ میا ڈھال دی گئی ہے۔ اور ایک ایسا بشر ہے جس کی بشریت کا خمیر

رسالت سے اٹھا گیا ہے۔

بشرتیت اور رسالت کے دونوں پہلواس بات کا تقاضا کر رہے تھے کہ مالکِ کائنات دونوں منزلوں میں اپنے حبیب کی عظمت کا اعلان کرے اور دنیا کو بتائے کہ یہ بشرتیت کے اعتبار سے کتنا پاکیزہ کردار ہے اور منصب کے لحاظ سے کتنا بلند مرتبہ۔

شاید یہی وجہ تھی کہ مالکِ کائنات نے اپنے حبیب کے تعارف میں دونوں استعمال کیں۔ ایک محمد اور ایک رسول۔ محمد یعنی قابل تعریف و توصیف۔ رسول، یعنی تبلیغِ دین و شریعت کا ذمہ دار۔ ایک ذاتی کردار کی طرف اشارہ ہے اور ایک منصبی فرائض کی طرف۔ گویا قدرت یہ بتاتا چاہتی ہے کہ میرا حبیب بشری کردار کے اعتبار سے محمد ہے۔ اور منصبی فرائض کے اعتبار سے رسول۔ اب جتنا محمدیت پر غور کرتے جاؤ گے اس کی ذاتی زندگی کے کمالات کھلتے جائیں گے۔ اور جتنا رسالت کو پہچانتے جاؤ گے اس کی معنوی بندی زگاہوں کے سلسلہ آتی جائے گی۔

ضرورت ہے کہ ان دونوں کی مکمل معنویت پر غور کیا جائے، تاکہ پیغمبرِ اسلام کی زندگی کا پورا خالکہ زگاہوں کے سامنے آجائے۔ لفظ رسول کے پارے میں پھر کمی بحث کی جائے گی۔ آج صرف لفظِ محمد کی شرح مقصود ہے۔

یاد رکھیں لفظِ محمد عربی زبان کا لفظ ہے جو محمد سے بنایا گیا ہے۔

حمد کے معنی ہی اختیاری کمالات پر تعریف کرنا۔ اسی حمد سے محمود

بھی نکلا ہے اور حمد بھی — محمود کے معنی ہیں جس کی تعریف کی جائے اور محمد کے معنی ہیں حمد کی بہت زیادہ تعریف کی جائے۔

سمجھیں نہیں آتا کہ مالک کائنات نے اپنا نام محمود رکھا ہے — اور اپنے حبیب کو حمد رکھا ہے ؟ بندہ کبھی اتنی تعریف کے لائق ہوئی نہیں سکتا جتنا لائق تعریف مجدد اور مالک ہے — پھر کیا وجہ ہے کہ اپنے کو لائق تعریف کہا ہے اور اسے بہت زیادہ لائق تعریف — اس کے نہ کمالات مالک کے برابر سو سکتے ہیں اور نہ اختیارات — بندہ پھر بندہ ہے اور مالک پھر مالک — بندہ کے پاس جو کچھ ہے سب مالک ہی کا دیا ہوا ہے جہاں تک میں نے غور کیا ہے ایک ہی بات سمجھیں آتی ہے اور وہ یہ کہ حمد خدا کی بھی ہوتی ہے اور محمد مصطفیٰ ام کی بھی — لیکن دونوں کی تعریف میں ایک نمایاں فرق ہے اور وہ یہ کہ خدا کی جتنی بھی حمد ہوتی ہے سب میں قابلٰ حمد خدا ہے اور حمد کرنے والے بندے اور حمود عربی کی جو تعریف ہوتی ہے، اس میں قابلٰ تعریف بندہ ہے اور تعریف کرنے والا خدا — گویا مالک اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ دیکھو تعریف میری بھی ہوتی ہے اور اس کی بھی، لیکن فرق یہ ہے کہ میری تعریف کرنے والے بندے ہیں اور اس کی تعریف کرنے والا میں ہوں — اور یہی فرق ہے کہ جس کی تعریف بندے کرتے ہیں وہ محمود ہوتا ہے اور جس کی تعریف خدا کرتا ہے وہ محمد ہوتا ہے۔

پہچانا آپ نے کہ اس نامِ محمد میں کیا کمالات ہیں — یہ نام نہیں بے مالک کی طرف سے بے حد و انتہا قابلٰ تعریف ہونے کی سند ہے

یہ نام نہیں ہے اس بات کا اعلان ہے کہ اس بندہ کی تعریف میں خود مالک  
بھی ”رطب اللسان“ ہے

ظاہر ہے کہ جسے خدا قابلِ حمد و شناختنے کا اُس کی زندگی کیسی  
ہوگی اور اس کا کردار کیا ہوگا — بلکہ مجھے تو اہل عربیت سے پوچھنا،  
کہ حمد کا استعمال ”اختیاری کمالات کی تعریف“ کے باعث میں ہوتا ہے  
اور کائنات کا اختیار صرف مالک کے ہاتھ میں ہے اور اسی لیے مرتب کیلئے  
مدح کا استعمال ہوتا ہے اور خدا کے لیے حمد کا — تو خود خدا نے بندہ کے  
لیے اس لفظ کا استعمال کیوں کیا۔؟ کیا اسے زبان کی ان نزاکتوں کے  
اطلاع نہیں ہے۔ کیا معاذ اللہ وہ عربی زبان کے خصوصیات سے  
باخبر نہیں ہے؟ — اہل ادب جواب دیں گے، نہیں۔ اس نے ان تمام  
نکات کو پیشیٰ تظریکتے کے بعد اپنے حبیب کو نامِ محمدؐ سے فواز لے تواب  
مجھے کہنے دیجیے کہ یہ نام صرف کردار کی پاکیزگی کا اعلان نہیں ہے بلکہ اس  
بات کا بھی اعلان ہے کہ میں نے کل کائنات کا اختیار بھی اپنے حبیبؐ<sup>۹</sup>  
کو دے دیا ہے۔ صاحبِ اختیار نہ بنا یا ہوتا تو اسے مدد و حمایت کرتا۔ حمد نہ  
کہتا۔ محمدؐ اسی لیے کہا ہے کہ تم ایک لفظ سے اس کے کردار کا بھی اندازہ  
کرو اور اس کے اختیارات کی حدودی کا بھی پتہ گالو — یہ بلندیوں کی  
اس منزل پر ہے جہاں نہ کردار کی عظمت سمجھ میں آتی ہے اور نہ اختیارات  
کی وسعت۔ پاکیزگی کردار کا یہ عالم ہے کہ خدا سے لیکر دسمن تک سب  
تعریف کرتے ہیں اور وسعتِ اختیار کی یہ کیفیت ہے کہ ذراتِ زمین سے

لے کر عرشِ اعظم تک سب اس کے زیر قدم رہتے ہیں۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد میں اہلِ اسلام سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں اور مجھے ان کی غیرتِ اسلامی کو چیلنج کرنا ہے۔ مسلمانوں! تم نے تو اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر صبح و شام اقرار کیا:

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ (ساریِ حمدِ اللہ کے لیے ہے) یہ تم نے کسی بندہ کو لا تَنْ حَمْدَ اور حُمَدَ کیسے مان لیا؟ کیا الحمدُ لِلّٰہ کہتے وقت حمد کا کچھ حصہ بجا لیا تھا جسے نبوت کی منزل میں صرف کروید یا تم تھارے کردار کا یہی انداز ہے کہ خدا کے سامنے جاؤ تو ہو، الْحَمْدُ لِلّٰہ ساری تعریفِ تیرے لیے ہے؟ اور بندے کے سامنے جاؤ تو کہو: ”مُحَمَّدُ رَسُولُ اللّٰہِ“، یعنی میرے سرکار آپ بھی حمد اور مستحقِ حمد ہیں۔

خدا جانتا ہے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر غور و فکر کرنا دنیا کے اسلام کا ایک فرض ہے۔ اور الحمدُ لِلّٰہ کہلوانے والے خدا نے اپنے بندہ کا نام محمد اسی لیے رکھ دیا ہے کہ امتِ اسلامیہ اس مسئلہ پر غور کرے اور سوچے کہ ان دونوں کا اجتماع کیونکر ہو گا اور دونوں نظریات ایک نقطہ پر کس طرح جمع ہوں گے۔

یاد رکھئے کہ اگر مرسلِ اعظم کو محمد خود خدا نے نہ کہہ دیا ہوتا تو اس نام سے یاد کرنا ایک طرح کا شرک ہو جاتا، اور کوئی مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان نہ رہ جاتا۔ یہ مالک کا حرم و کرم تھا کہ اس نے خود ہی اپنے بندہ

کا نام حسین شد رکھ دیا اور اس طرح ذہنوں کو ایک راستہ مل گیا۔ اور  
مسئلہ کا ایک مستقل حل نکل آیا۔

مالکِ کائنات یہ بتانا چاہتے ہے کہ میرے بندے تیرا فرض ہے  
کہ تو الحمد للہ کہہ کر ساری حمد و شاد میرے حوالے کر دے۔ بخچے  
اپنے پاس کچھ رکھنے کا حق نہیں ہے۔ اس کے بعد مجھے اختیار ہے کہ میں  
جسے چاہوں گا حوالے کر دوں گا۔ اور جب تو نے ساری حمد کی میری  
ملکیت ہونے کا قرار کر لیا تو اب بخچے یہ بتاتا ہوں کہ میں نے یہ حمد  
اپنے بندہ محمدؐ کے حوالے کر دی ہے۔ تو نے میری حمد کی توکہ  
**الحمد للہ**۔ میں نے اسے حمد دیدی تو کہا:

**وَعَامُحَمَّدٌ الْأَرْسُولُ،**

اب اس فلسفہ کو یاد رکھنا۔ کہ الحمد للہ کے بعد  
معتھیں کسی کو لائق حمد و شاد بنانے کا حق نہیں ہے اور یہ حق صرف  
مالکِ کائنات کا ہے وہ جسے چلے ہے قابل تعریف بنائے۔ بندہ  
کافرض صرف یہ ہے کہ وہ جس کی تعریف کر دے اُس کی تعریف کریا۔  
اور جسے ہر اکہہ دے اُسے بڑا کہتا ہے۔ اپنے پاس کسی فیصلہ کا  
اختیار نہیں ہے۔ وہ کسی کوئی کہے تو نبی کہو۔ ولی کہے تو ولی کہو۔  
امام و خلیفہ کہے تو امام و خلیفہ کہو۔ اور لعنت و بیات کا ستح  
قرار دے تو اس کا بھی اظہار کرو۔

مرسلِ عظیم کے اسم گرامی کے بارے میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے۔

کہ یہ نام مالکِ کائنات کا عطا کیا ہوا ہے اور اسی نے اپنے حبیب کو اس عظیم لقب سے سرفراز فرمایا ہے۔ اور نام جب کسی عالم انسان کی طرف سے ہوتا ہے تو اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی۔ بہت سے بہت ایک فال نیک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اچھا نام یہ سمجھ کر رکھا جاتا ہے کہ جب مُستقبل میں اچھے کردار کا مالک ہوگا۔ علیٰ و محمد نام رکھنے سے کوئی علیٰ و محمد نہیں ہو جاتا، لیکن یہ امید ضرور تھی ہے کہ علیٰ و محمد نہیں ہو سکتا تو کم اذکم ان کا پیر و اور فرمابر وار ضرور ہوگا۔ لیکن یہی نام جب کسی عالم الغیب ہستی کی طرف سے ہوتا ہے تو اس کی حیثیت شکون کی نہیں ہوتی، بلکہ اس میں مُستقبل کے کردار کی ضمانت ہوتی ہے اور یہ شکل پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر اس کا کردار نام کے مطابق ہونے والا نہیں تھا تو اپنے مُستقبل سے باخبر ہونے کے باوجود یہ نام کیوں رکھا۔ ایسے حالات میں اپنے علم کی لاج رکھنے کے لیے عالم الغیب کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ کردار کو دیکھ کر نام مقرر کرے تاکہ اپنے علم کے دامن پر دھبہ نہ آنے پائے۔

مالکِ کائنات عالم الغیب ہے۔ وہ مُستقبل کے حالات سے باخبر ہے۔ ہر شے کا مُستقبل اس کے ہاتھوں میں ہے اور اس نے اپنے حبیب کا نام محمد رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے پیغمبر کی پوری زندگی کا جائزہ لے لیا ہے۔ اور اس کے بعد انھیں محمد قرار دیا ہے۔ اب یہ نام صرف نام نہیں ہے بلکہ ایک

ضمانات اور ذمہ داری ہے کہ اس کی پوری زندگی محمد ہے۔ یہ اُٹھے تو  
محمد ہے۔ بیٹھے تو محمد ہے۔ سوئے تو محمد ہے جا گے تو محمد ہے۔ بندگی  
کرے تو محمد ہے۔ مزدوری کرے تو محمد ہے۔ بزمِ اصحاب میں رہے تو  
محمد ہے۔ اور عرشِ اعظم کی سیر کرے تو محمد ہے۔

رسلِ اعظم کے اسمِ گرامی کے سلسلے میں ایک نکتہ یہ بھی قابلِ توجہ  
ہے کہ مالک نے اپنے حبیب کے دونام رکھے ہیں۔ جناب عیسیٰ کے  
ذریعہ یہ اعلان کرایا ہے کہ میرے بعد آنے والے نبی کا نام احمد  
ہوگا۔ اور ہم سے یہ بتایا ہے کہ ہمارا یہ حبیب محمد ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا  
کہ یہ دونام کسے؟ — اور اس نام بدلنے کا فلسفہ کیا ہے؟ کیا یہ  
نبی وہی نہیں ہے جس کی خبر عیسیٰ نے دی تھی۔ کیا پور درگار کو یہ بیاد  
نہیں رہا کہ اس نے عیسیٰ کی زبان سے احمد نام بتایا ہے۔ کیا جناب  
عیسیٰ نے صحیح نام نہیں بتایا تھا۔ — نہیں ایسا کچھ نہیں ہے حقیقت  
یہ ہے کہ یہ احمد تھی ہے اور محمد بھی، اور اس کا نکتہ اس وقت ظاہر ہوگا  
جب دولوں کے معنی پر غور کیا جائے گا۔

یاد رکھیے! اعری زبان میں احمد کے معنی ہیں بہت زیادہ تعریف  
کرنے والا۔ اور محمد کے معنی ہیں جس کی بہت زیادہ تعریف کی جائے  
یہ رسول احمد تھی ہے اور محمد بھی۔ — فرق یہ ہے کہ دنیا میں آنے  
سے پہلے احمد تھا، اور آیا، تو محمد بن کر۔ سمجھ آپ! یہ کیا انقلاب  
ہوگیا اور مالک نے کس عظیم کردار کی طرف اشارہ کر دیا۔ حقیقتاً قدرت

یہ بتانا چاہتی ہے کہ بندے نے عالمِ طاہر میں قدم رکھنے سے پہلے عالمِ الوار میں اتنی زیادہ حمد کی ہے کہ ہم نے اسے قابلِ حمد و شناز بنا دیا ہے۔ کل جب یہ ہماری حمد کر رہا تھا تو احمد تھا۔ آج جب ہم نے اسے قابلِ حمد و شناز بنا دیا ہے تو محمدؐ سوگیا ہے۔

لائے دنیا کوئی ایسا انسان جسے مالک نے یہ شرف بخشناہ اور پیش کرے کوئی ایسا کردار جسے یہ بلندیاں نصیب ہوں۔ یہ عظمتیں تو صرفِ محمدؐ کے گھرانے میں دیکھی ہیں جہاں ایک حسن کردار میں محمدؐ ہے تو دوسرا بلندیوں میں علیؐ۔ ایک اپنے اقدام میں حسن ہے تو دوسرا اپنے عمل میں حسین۔ جو ہے وہ صاحبِ عظمت۔ جو ہے وہ صاحبِ کردار اور کردار میں بھی ایسی ریگانگت اور یکسانیت کہ جسے دیکھا مجھُ ی نظر آیا اول بھی محمدؐ، او سط بھی محمدؐ، آخر بھی محمدؐ اور کل کے کل محمدؐ۔

معصوم تو معصوم، اس گھر میں ایسے غیر معصوم بھی ملتے ہیں جنہوں نے آنونشِ عصمت میں تربیت پانے کے بعد اپنے کو عظمتِ کردار کی اس منزل پر پہنچا دیا ہے جہاں تک عامِ السالوں کو پہنچنا دشوار ملکہ ناممکن ہے۔ وہ صاحبِ عصمت علیؐ تھے جنہوں نے میدانِ جنگ میں اعلان کیا تھا۔ ابوطالب کے لال کوموت سے اتنا ہی انس ہے جتنا بچہ کو شیرِ مادر سے ہوتا ہے اور یہ کمن شہزادہ قاسم ہے جو اعلان کر رہا ہے چماموت شہد سے بھی زیادہ شیری ہے۔

کیا تاریخ میں کبھی ایسے بچے بھی ملے ہیں جو موت کے لیے تڑپ لے ہے

ہوں اور نلواروں سے کھلنے کے لیے تیچین ہوں۔ جسین ہی کے لشکر  
کا خاصہ ہے جہاں ایک ایک بچہ موت کی گودی تیں کھلنے کے لیے  
تیچین اور ایک ایک جوان عروں موت سے ہمکنار ہونے کے لیے  
بنتا ہے۔

تاریخ کر بلاؤ اہ ہے کہ حب حسین نے عاشور کی شبِ محض شہادت  
پیش کر کے ایک ایک کو خبر شہادت سُنائی تو اصحاب واعداہ میں خوشی  
کی ایک لہر دُڑگئی۔ مرنے کی نجاستی گویا عروی کافر دہ سُنا یا گیا۔ گلائٹن  
کی اطلاع کیا ملی گویا کوئی عظیم انعام ہاتھ آگیا۔ باں ایک کمن بچہ  
تحابس نے اپنا نام نہیں سُنا تو تیچین ہو کر خیر کے ایک گوشے میں آیا  
اور زار و قطار رونا شروع کیا۔ ہاتھ میرا مقدار۔ سب گلا  
کٹائیں گے میں رہ جاؤں گا۔ سب مولا کے کام آئیں گے میں نہ  
آسکوں گا۔ سچ ہے کیوں نہ ہو میرا مقدار ہی ایسا ہے۔ بچنے میں  
بایپ کے سایہ سے محروم ہو گیا۔ اب ایک منزل شہادت رہ گئی تھی اس  
سے بھی محروم ہو جاؤں گا۔ روتے روتنے دل میں خیال آیا کہ میرے بازو  
پر ایک تعویذ بندھا ہے۔ جو میرے بایانے مشکل کے وقت کے لیے  
باندھ دیا تھا۔ دیکھوں شاید میری مشکل کا حل نکل آئے۔ شاید میری  
خوش قسمتی کا راز اسی دستاویز میں پوشیدہ ہو۔

یہ سوچ کر تعویذ کو کھولا۔ غور سے پڑھا۔ کیا دیکھا۔  
بایپ نے لکھا ہے۔ میرے لال قاسم! اگر تیرے چھا پر وقت پڑ جائے۔

تو ان کی نصرت ضرور کرنا اور ان پر قریان ہو جانا۔ قربانی کا پیغام  
 سُنا۔ دل میں مستست کی لمبہ درگتی۔ خوشی خوشی چچا کی خدمت  
 میں آئے۔ چچا! ذرا اس تحریر کو تو پڑھیں۔ امام حسین نے کہا بیٹا  
 یہ کیا ہے؟ عرض کی میرے بیبا کا نوشتہ ہے۔ اس میں کچھ آپ  
 ہی سے متعلق لکھا ہے حسین نے تجوید کولیا۔ بھائی کی تصویر زگا ہوں میں  
 پھر گئی۔ کمالِ اشتیاق سے تحریر کو دیکھا اور ایک مرتبہ پیساخت رونے  
 لگے۔ قاسم نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ چچا! اس میں رونے کی کیا  
 بات ہے؟ آپ گریہ کیوں فرم رہے ہیں؟ حسین نے دل سنبھال  
 کر کہا، میرے لال! یہ تحریر لائے ہو بیا اپنی موت کا پیغام لائے ہو؟  
 بیٹا! یہ جھٹپٹے سے معلوم تھا۔ کل تو یہ بھرا گھر اجڑنے والا ہے۔  
 میں نے تیری کمٹی کو دیکھ کر تیری شہادت کی خبر نہیں سنائی تھی۔ تیرے نام  
 کے ساتھ موت کا تصویر میری زگا ہوں کے سامنے بھائی کی مٹی ہوئی تصویر  
 کا خیال لے آتا تھا۔ اے قاسم! تیرا کیا ذکر ہے۔ کل تو تیرا بھیتا  
 علی اصنغر بھی قربان ہو جائے گا۔ اپنی موت کے تصویر پر منسے والا  
 قاسم، علی اصنغر کا ذکر سُننے ہی چونک پڑا۔ چچا! یہ آپ نے کیا فرمایا۔  
 میرا بھیتا علی اصنغر۔؟ میرا بھپٹا بھیتا علی اصنغر۔؟ اصنغر کی  
 شہادت کے کیا معنی۔؟ کیا اشقياء رخيمہ میں داخل ہو جائیں گے؟  
 باشی غیرت دار کا سارا بدن کا نپنے رگا۔ اشقياء اور رخيمہ۔؟  
 یہاں تو خدراتِ عصمت و طہارت ہیں۔ یہاں تو خاذانِ رسالت کی

شہزادیاں ہیں ۔ امام حسین قاسم کے جذبات کو سمجھ گئے ۔ فرمایا  
 نہیں بیٹا قاسم ۔ میں اصغر کو نیک مریدان میں جاؤں گا۔  
 ول چاہتا ہے عرض کروں حسن کے نورِ نظر قاسم ۔ ! ہاشمی  
 غیرت دار قاسم ۔ تم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اشیقا خمیوں کے اندر  
 آجائیں ۔ یہ عاشور کی رات ہے ۔ کاش تم عصر عاشور ہوتے تو  
 دیکھتے خمیوں میں آگ لگی ہوئی ہے ۔ چادریں چپن رہی ہیں ۔ اور  
 سید انیاں ایک خمیہ سے دوسرے خمیہ کی طرف دوڑ رہی ہیں ۔  
 رات گزری ۔ عاشور کا لزرتا ہوا سورج طلوع ہوا ۔ فوج دشمن  
 میں جنگ کی تیاریاں شروع ہوئیں ۔ حسین اپنی مختصر سی سپاہ کو ترتیب  
 دینے لگے ۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ تیروں کا مینہہ بر سنتے لگا ۔ اصحاب  
 نے میدان میں قدم جائے ۔ بہت سے چاہنے والے دل و شجاعت  
 دے کر دنیا سے رخصت ہوئے ۔ ظہر کا ہنگام آیا ۔ شماز ظہر  
 ادا ہوئی ۔ اصحاب کے بعد اعزاز کی باری آئی ۔ ایک مرتبہ  
 اُم فروہ کا لال دستِ ادب جوڑ کر سانتے آیا ۔ چھا ! اب اجازت دیکھیے  
 ۔ آخر میں کب تک ان قریانیوں کو دیکھتا ہوں گا ۔ اب دل تنگ  
 ہو رہا ہے اور آپ کی بیکسی تڑپا رہی ہے ۔ حسین نے قاسم کو صرسے پیر  
 تک دیکھا ۔ قاسم کے چہرے میں مرحوم بھائی کی تصویر نظر آئی آنکھوں  
 میں آنسو آگئے ۔ ول سنبھال کر فرمایا ۔ میرے لال ! کیا واقع امر نے پر  
 آمادہ ہو گئے ۔ بیٹا کیا اب بھیا کی تصویر خاک میں مل جائے گی ؟ قاسم

نے اصرار کیا۔ حسین دل سنبھال لئے سنبھال لئے بھی ہاں نہیں کہہ سکے۔  
 ایک مرتبہ قاسم نے جھپک کر سرقدروں پر رکھ دیا اور سپروں کو چومنا شروع کر دیا۔ حسین نے ترپ کے گلے سے لگایا۔ دل نے آواز دی۔ جاؤ  
 میرے لال جاؤ۔ آج تو مجھے سارے داغ اٹھانا ہیں۔ جاؤ قاسم  
 جاؤ۔ چچا تمھاری لاش پر بھی آنسو بیہائے گا۔ جاؤ بیٹھا جاؤ۔  
 اب ان آنکھوں سے بھیا کی مشتی سوئی تصویر بھی دیکھوں گا۔

اجازت ملی، قاسم چلے۔ سارے مناظر کا ذکر نہیں کروں گا۔ لیس  
 ایک منظر۔ زخموں سے چوڑ سو کر گھوڑے سے گرے، چچا کو آواز دی۔ حسین  
 تیزی سے بڑھے۔ کیا دیکھا۔ قاتل سر ہلنے متوار لیے بیٹھا ہے اور گلا کاٹنا  
 ہی چاہتا ہے۔ خدا کسی چچا کو میتظر نہ کھاتے۔ ترپ کر آواز دی۔ قاسم گھر انہیں میں آگیا۔ بیٹھا! تیرا چچا تیرے قریب ہے۔ قاتل نے مولا کی پر آواز  
 سنی۔ لشکر کو آواز دی۔ دور ٹو! میں حسین کے حملہ کی زد پر آگی لشکر تیزی  
 سے بڑھا۔ ادھر میں ادھر۔ ادھر سے بڑھا ہوا لشکر اور زیج میں قاسم کا جسم نازین۔  
 گھوڑے قاسم کے جسم نازین سے گزر گئے۔ کمن لال کے سینے کی ٹہریاں  
 ٹوٹنے لگیں۔ جب گھوڑے کی ٹاپ سینے پر پڑتی تھی تو بیساختہ زبان سے  
 نکل جاتا تھا۔ چچا۔ چچا۔ چچا۔ حسین کلیجہ مکپڑ کر بیٹھو گئے۔ ہائے میرے قاسم  
 میرے لال۔ میرے جان برادر۔ تیرا چچا شرمندہ ہے کہ تیرے کام نہ آس کا اور اس  
 وقت آیا جب تیرا جسم گھوڑوں کی ٹاپلوں سے پا مال ہو گیا۔

”إِنَّا بِلِهٖ وَإِنَّا إِلَيْهِ دَاجِعُونَ“



أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَنِ الرَّجِيمِ  
 بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ • وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ  
 عَلَى سَيِّدِ الْأَنْشِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ • سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا  
 أَفِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٌ وَاللَّهُ الطَّيِّبُونَ الطَّاهِرُونَ  
 وَاللَّعْنَةُ الدَّائِمَةُ عَلَى أَعْدَائِهِمْ وَقَاتِلِيهِمْ  
 أَحَمَّعِينَ مِنَ الْأَنْ to قِيَامِ لِوْمَ الدِّينِ •  
 أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللَّهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ  
 ”وَمَا هُنَّ بِمُؤْمِنِينَ إِلَّا رَسُولُهُ“

مالک کائنات اپنے حبیت کا تعارف کرتے ہوتے ارشاد

فرمایا ہے۔ ”یہ محمد صرف میرا رسول ہے۔“  
 اس میں رسالت کے علاوہ کوئی چیز تلاش کرنے کی کوشش نہ کرنا  
 قرآن حکیم کے اس فقرہ کے بارے میں آج مجھے اس نکتہ پر تبرہ

کرنا ہے کہ مالکِ کائنات نے اپنے جیسی کے رسول ہونے کا اعلان کیا ہے۔ رسول بنانے کا اعلان نہیں کیا۔ قدرت یہ بتانا چاہتی ہے کہ آج میں جس رسالت کا اعلان کر رہا ہوں، وہ آج کی نہیں بلکہ جیسے دنیا میں آیا ہے رسول ہی بن کر آیا ہے۔

رسالت کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان یہ ایک عجیب غریب بحث ہے کہ رسول، رسول بن کر دنیا میں آتا ہے یا یہاں آنے کے بعد دنیا کے دوسرے عہدیداروں کی طرح رسول بنایا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا ہے جو مسلمِ اعظم کو اپنے ائمہ حیات سے رسول نہیں مانتا اور اس کا یہی خیال ہے کہ پیغمبرؐ بھی دنیا کے دوسرے عہدیداروں کی طرح ایک مدت گذرنے کے بعد راست کی ذمہ داریاں سنبھالتا ہے اور مالکِ کائنات اس کی صلاحیتوں کا تجربہ کرنے کے بعد اسے منصبِ عطا کرتا ہے۔ ان مسلمانوں کے تردیدک بعثت کا ہلاہو امفہوم یہ ہے کہ چالیس سال کی عمر میں اللہ نے پیغمبرؐ کو رسالت کے عہدہ سے سفر فراز فرمایا۔ اس سے پہلے وہ سب کچھ تھے لیکن رسول نہیں تھے۔ اسی رسول نہ ہونے کے نظریہ نے دنیا کو کردار پیغمبرؐ پر بحث کرنے کا موقع دیدیا اور اب مسلمانوں ہمیں یہ بحث چھپڑگئی کہ رسول نہ ہونے کے دور میں رسول کیسا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔ اور اس کے اعمال و کردار کی کیا نوعیت ہوتی ہے۔؟

بعض مسلمانوں نے توصاف لفظوں میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ رسالت سے پہلے رسول ہر براہی کام تک ہو سکتا ہے یہاں تک کہ کافر بھی ہو سکتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں ۔ یہ ہے مسلمانوں کا ذہن ۔ اور یہ ہے ان کا رسول ۔ حرمت تو یہ ہے کہ یہ خیالات اس دور میں پیدا کیے جا رہے ہیں جب دنیا کی ہر قوم اپنے لیڈر اور اپنے رہنماء کے کردار کو بلند کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہے ۔

محبے اس وقت ان نظریات پر تصریحہ کرنا نہیں ہے ۔ صرف یہ کہنا ہے کہ اگر یہ نظریہ سلیم بھی کر لیا جائے تو مرسلِ عظیمؐ کی حیاتِ طیبہ پر کوئی اثر نہ پڑے گا، اور نہ آپؐ کی زندگی کو نشانہ اعتراض بنایا جاسکتا ہے ۔ اعتراض میں صاف لفظوں میں اقرار کر لیا گیا ہے کہ یہ ساری باتیں رسالت سے پہلے پہلے جائز ہیں۔ نبوت و رسالت کے بعد ان براشیوں کا کوئی امکان نہیں ہے۔ نبوت پانے کے بعد نبی عالم بھی ہوتا ہے، اور معصوم بھی۔ بلند کردار بھی ہوتا ہے اور بلند افکار بھی۔ اب مرسلِ عظیمؐ کی زندگی میں اس دور کا جائزہ لینا پڑے گا جب آپؐ رسول نہیں تھے۔ اگر ایسا کوئی دور مل گیا تو آپؐ کا کردار موصوعِ گفتگو بتایا جائے گا اور ایسا کوئی دور نظر ہی نہ آیا تو نبوت کے کردار پر کسی بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ آئیے دیکھیں کہ پروردگارِ عالم کا ارشاد کیا ہے اور یہی نے رسالت کا منصب دیا ہے اس نے کب اور کن حالات میں دیا ہے۔ قرآن مجید کا اعلان ہے۔ ”**هَوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأَوْمَانِ رَسُولًا مِّنْهُمْ**

” وہ خداوہ ہے جس نے مکہ والوں کے درمیان ایک رسول بھیجا ہے جو انھیں میں سے ہے۔ ”

اربابِ نظر غور کریں۔ مالکِ کائنات نے مکہ والوں میں رسول بھیجا ہے، بنایا تھیں — بھیجنے اور بنانے کا فرق محسوس کرنا ہے تو ایک مرتبہ دنیا کے عہدوں کا جائزہ لینا ہوگا۔ دنیا کے عہدوں کی قسمیں ہیں۔ ایک عہدہ وہ ہوتا ہے جس میں بھیجنے کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ جو صاحبِ صلاحیت جہاں ہوتا ہے اسے وہی عہدہ دار بنادیا جاتا ہے۔ جیسے سفارت کا عہدہ کسی ملک میں سفارت کا عہدہ اس ملک کے باشندے کو نہیں دیا جاتا ہے بلکہ ہر ایک اپنے ملک کے آدمی کو سفیر بناد کر دوسرے ملک میں بھیجی کرتا ہے ایسے عہدوں میں یہی دیکھنا ہے کہ حکومتیں کسی آدمی کو دوسرے ملک میں عام باشندوں کی طرح بھیج کر ایک عرصہ کے بعد اپنا سفیر بنادیا کرتی ہیں یا سفارت کی ساری ذمہ داریاں دے کر بھیجا کرتی ہیں لیکن ہوئی بات ہے کہ سفیر دوسرے ملک میں نہیں بنایا جاتا۔ بلکہ اپنے ملک میں بناد کر دوسرے ملک میں بھیجا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بھیجنے میں دو معانی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ جسے بھیجا گیا ہے اسے پہلے عہدہ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد بھیجا گیا ہے اور دوسری بات یہ کہ جہاں بھیجا گیا ہے عہدہ وہاں کا نہیں ہے بلکہ اپنے ہمراہ کہیں سے لیکر آیا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب دنیا کی عام حکومتیں اپنا نامزدہ بھیجیں تو کسی انسان کو یہ کہنے کا حق نہیں پیدا ہوتا کہ ابھی تو آپ آئے ہیں دس بیس سال

کام کیجیے، اس کے بعد ہم آپ کی سفارت پر غور کریں گے بلکہ جس دن سفیر پانے ملک سے نکلتا ہے اسی دن اسے سفیر تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ چاہے دوسرے ملک میں پہنچنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو جائے اور جب مذہب کی بات آتی ہے تو خدا تعالیٰ نمائندہ کے بارے میں یہ بحثیں اٹھائی جاتی ہیں کہ وہ کب سے نبی ہے، اور کب سے رسالت کے منصب پر فائز ہوا ہے۔

قرآن حکیم نے یعشت کا فقط منتخب کر کے مسلمانوں کے ذمہنوں کو بیس دار کر دیا کہ ہم نے مکہ میں رسول بھیجا ہے، رسول بنایا ہیں بلکہ رسول بناؤ کر مکہ میں بھیجا ہے۔ اب اندازہ کرو کہ یہ بشر نہیں ہے رسول ہے اور اس کی رسالت متحاب سے گھر کی نہیں ہے بلکہ ہمارے گھر کی ہے۔

یاد رکھیے ۔ ! نمائندگی والے عہدوں عام ملکی عہدوں سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہوتے ہیں۔ ملک کے اندر کے عہدوں میں عہدہ دار نظام حکومت کے زیر نگرانی کام کرتا ہے۔ اسے ہر وقت حکومت کی کڑی نگرانی کا سامنا رہتا ہے۔ احکام حکومت کے ہوتے ہیں اور عمل درآمد حکام کا ۔ اور نمائندگی کے عہدوں کا اندازہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہاں سفیر کے افکار و کردار پر اتنا اعتماد ہوتا ہے کہ وہ پانے ہر عمل میں حکومت کی رائے کا منتظر نہیں رہتا، بلکہ حکومت کی پوری پالیسی کو سمجھو کر دوسرے ملکوں میں جاتا ہے، اور اسی پالیسی کے تحت معاملات طے کرتا رہتا ہے۔ اور حکومت اسے سفیر کی رائے نہیں قرار دیتی

بلکہ اپنی رائے قرار دیتی ہے۔

توجب عامِ انسان اپنے عہدوں میں اتنی اختیاط بر تھے ہیں تو مالکِ کائنات کی اختیاط کا کیا عالم ہوگا، اور وہ سفیر بنائے گا تو اس کا کردار کتنا بلند ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مالکِ کائنات نے جسے بھی سفارت کا عہدہ دیا ہے اپنی پوری تنظیم سے باخبر کر کے دن میں بھیجا، تاکہ یہ مشیت کی روشنی میں اپنے اعمال کو انجام دیتا رہے اور میں یہ اعلان کرتا رہوں کہ یہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا، یہ جو کچھ کہہ رہا ہے سب میری وحی کے مرطابی ہے۔ اس نے سنگریز سے خود نہیں پھینکے ہیں، میں نے پھینکے ہیں۔ اس کا ارادہ اپنا ارادہ نہیں ہے، میرا رادہ ہے۔

مسلمانو! کیا کوئی عام خاطی اور گنہگار انسان زندگی کے کسی موڑ پر رینٹل حاصل کر سکتا ہے کہ اس کا قول فعل اس کی رفتار و گفتار سب مالکِ کائنات کی طرف منسوب ہو جائے۔

مجھے توجیہت ہوتی ہے کہ یہی مسلمان جب قرآن مجید میں یہ آیت

پڑھتا ہے:

«وَمَا أَشْ سَلْنَكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ»

(اے رسول! ہم نے آپ کو رحمت (عالیں کیلئے) بناؤ کر بھیجا، تو کہتا ہے کہ حضور یہاں آگر رحمت نہیں بنے بلکہ حب آئے تھے تو رحمت تھے اور حب عرشِ اعظم پر جلوہ فرمائئے جب بھی رحمت ہی تھے اور حب یہ

آیت سامنے آتی ہے :

”بَعَثَ فِي الْأُمَّيْمَنَ رَسُولًا“

(اس نے مکہ والوں میں رسول بھیجا ہے) تو یہ بخشیں شروع ہو جاتی ہیں کہ دنیا میں آنے کے بعد کب سے رسول ہو گئے یہ ایمان کی کمزوری اور عمل سے فارک صورت ہے جہاں مسلمان کلمہ طہ حنفے کے بعد بھی نبی کی زندگی پر بھروسہ کرنا ہمیں چاہتا اور اسی نافہی کا نتیجہ تھا کہ عمر نبوت طرحتی رہی اور مسلمان منصب کا فیصلہ نہ کر سکے یہاں تک کہ حدیبیہ کی منزل آگئی اور فیصلہ نہ ہو سکا — بلکہ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ نبی کی زندگی کا آخری وقت آگیا اور مسلمان فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ رسول ہیں یا نہیں۔

اگر ایمان اسی کا نام ہے تو نفاق کیلے، اگر اسلام اسی کو کہتے ہیں تو کفر کے معنی کیا ہوں گے؟ یہی ایک سلسلہ نافہی ہے جو صدر اسلام سے چلا آ رہا ہے اور کچھ تک باقی ہے۔ اور آج بھی یہ بخشیں جاری ہیں کہ نبی کب سے نبی ہوتا ہے۔

میری تجھیں نہیں آتا کہ یہ مسلمان نبوت و رسالت کے مسائل خود کیوں حل کرنا چاہتے ہیں۔ اور نبی ہی سے دریافت کیوں نہیں کرتے کہ آپ کی نبوت کی منزل کیا ہے؟ آئیے چلیے، حضور سے پوچھیں کہ حضور کی نبوت کا سلسلہ کب سے شروع ہوا ہے — مرکا کو رسالت کا عہدہ کب ملا؟ آواز آتی ہے۔ ”وَكُنْتَ مِنَ الْمُنَّبِّهِينَ وَإِذْمَنْ بَيْنَ النَّاءِ وَالظِّئْنِ“ (حدیث)

(میں اس وقت بھی نبی متحاجب آدم آپ و گل کے درمیان تھے) اب پہچانا آپ نے اس وفادار امت کو۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ میں آدم سے پہلے نبی محتلا اور یہ سورج رہے ہیں کہ دنیا میں آنے کے بعد بھی نبی تھے یا نہیں۔ افسوس اس امت نے عرفان نبی میں کتنی ٹھوکریں کھاتی ہیں اور نبوت کی زندگی کو لکتنا بے وزن بنادیا ہے۔

حیرت تو یہ ہوتی ہے کہ یہ مسلمان ہمارے اوپر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ قوم نبوت کی معرفت نہیں رکھتی۔ اسے پیغمبر اسلام کی عظیمتوں کا علم نہیں ہے تو مجھے کہنے دیجیے کہ اگر عرفانِ نبوت یہی ہے تو یہم بے معرفت ہی اچھے ہیں، اور اگر اسلام اسی توہین پیغمبر کا نام ہے تو اس اسلام سے مشرکین کا فرزی اچھا تھا جو کم از کم صادق و امین تو سمجھتے تھے یہاں تو چالیس سال سے پہلے ہر بُرا نی کا جواز دھونڈا جا رہا ہے۔

اس سے زیادہ حیرت انگریز بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے رسولِ عظیم کو اشرف المرسلین اور خاتم النبیین قرار دیا ہے۔ اور قرآنِ حکیم میں جوانبیاں سابقین کی تاریخ ملتی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دیگر انتباہ کا مرتبہ رسولِ اسلام سے بلند تھا۔ آئیے ذرا ایک لظر اللہ کے عہدہ داروں کی تاریخ پڑالیں۔ سب سے پہلے حناب آدم کا نام آتا ہے جن کے منصب کا اعلان ان کی خلقت سے پہلے ہی ہو گیا اور مالک کائنات نے پیکر آدم کی تخلیق سے پہلے اعلان کر دیا کہ:

”میں روئے زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔“

یعنی اے ملائکہ ہو شیار ہو جاؤ ۔ ” اور اے قرآن کو بڑھنے والو  
ہوش ہیں آجائو ۔ ” کجو بنا بایا جا رہا ہے وہ عامِ انسان نہیں ہے بلکہ خلیفۃ اللہ  
ہے ۔ اب پہچانا آپ نے ۔ آدم کی خلافت اور ان کے منصب کا  
سدسہ کہاں سے شروع ہوا ہے ؟

جناب آدم کے بعد جناب ابراہیم کے حالات دیکھئے ۔ جہاں کمال  
عقل و شعور اور احساسِ ذمہ داری کا یہ عالم ہے کہ زندگی کی ابتدائی مترلوں  
سے گذر رہے ہیں اور کائنات کی بے شباتی، دنیا کی ناپائیداری کا حوالہ ریتے  
ہوئے رب العالمین کی حکمت و برتری کا اعلان کر رہے ہیں ۔

حضرت موسیٰ، فرعون کی آغوش ہیں ہیں اور نبوت کے ان کمالات کا  
منظہر کر رہے ہیں جنہیں دیکھ کر فرعون جیسا مغور و متکبر انسان بھی یہ  
اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ بچپن عالم بچوں جیسا بچہ نہیں ہے اس کا تو  
انداز ہی نہ لالا ہے۔ اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ وہی ہے جس کے باے  
میں مجھے خبر دی گئی ہے کہ میری حملکت میں بچہ پیدا ہو گا جو آگے چل کر میری  
حکومت کا تختہ الٹا دے گا۔

حضرت عیسیٰ مار کی گودی میں ہیں اور آواز دے رہے ہیں :  
” اَتَأْنِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَذِيًّا ”، اللہ نے مجھے کتاب دی ہے  
اور نبی بنا بایا ہے ۔ ”

بتانا یہ چلتے ہیں کہ منصبِ نبوت سن و سال اور عمر کا محتاج نہیں ہے  
میں آغوشِ مادر میں ہوں لیکن مجھے نبوت مل چکی ہے ۔

مسلمانو! ذرالنصلات سے بتاؤ محارار رسول کیونکہ افضل المرسلین بوجا مرسیین کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ قبل خلقت حامل منصب تھے۔ انبیاء کا کردار گواہ ہے کہ وہ بچپنے ہی سے اپنی نبوت کا اعلان واٹھہار کیا کرتے تھے اور ایک عتحار انبی سے جو چالیس سال کی عمر تک نبوت سے محروم رہا۔ کیا ایسے نبی کو بھی افضل الانبیاء کہا جاسکتا ہے۔

یاد رکھو! اگر حضور کی افضلیت کا تحفظ کرتا ہے، اگر اسلامی غیرت کو زندہ رکھتا ہے۔ تو ماہنا پڑے گا کہ اگر سارے انبیاء قبل خلقت نبی تھے۔ اگر آدم پیکر خاک کے قبل خلیفۃ اللہ تھے تو میرا نبی اُس وقت بھی نبی تھا جب کائنات عدم کے سذل میں سورہ بھی۔ جب آدم آب و گل کے منزل سے گزر رہے تھے۔ جب کون دمکان میں کچھ نہیں تھا لیکن خدا کی خدائی تھی اور محمدؐ کی جلوہ نمائی۔

ایسا ہی ایک ماحول تھا جب مانک نے جبریل کو پیدا کر کے ان سے پوچھا تھا کہ جبریل؟ بتاؤ تم کون ہو اور میں کون ہوں؟ اور جبریل حیرت زدہ سوکرہ دیکھ رہے تھے کہ پردہ غیب سے ایک آواز آئی تھی جبریل کہہ دو۔ ”لورت جدیل ہے اور میں عبدِ ذلیل۔ تیرانام جبلیل ہے اور میرا نام جبریل ہے۔

مانک نے جواب دیا۔ ملکوتیت کی عزت بچی عصمت کا وقار  
بڑھا۔ اور مجھے کہنا پڑا کہ جہاں خدا کی خدائی تھی وہیں محمدؐ کی جلوہ نمائی۔  
اور حبس ماحول میں محمدؐ کی جلوہ نمائی تھی اسی ماحول میں عتلی کی

## مشکل کشانی۔

منصبِ الہی کی اسی برتری کے ظاہر کرنے اور سن و سال کے اسی امتیاز کو مٹانے کے لیے مرسلِ اعظم مبارکہ کے میدان میں سب سے آگے حسینؑ کو لے گئے تھے گویا نبی یہ اعلان کر رہے تھے کہ دیکھو جو عمر میں سب سے کم ہے وہ حق کے معاملہ میں سب سے آگے آگئے ہے۔ ابھی تم نے حق کی عظمتوں کو نہیں پہچانا ہے۔ ابھی تھیں اہل منصب کی بلندیوں کا علم نہیں ہے۔

اربابِ عزا — ! رسولؐ نے مبارکہ کے میدان میں منصب دار کے پچھنے کی عظمت کا اظہار کیا اور حسینؑ نے کربلا میں شیرخوار کی عظمت کا اعلان کیا۔ حسینؑ نے آواز دی، دنیا سے اسلام ابھی تو منصب دار کی عظمت سے نا آشنا ہے تو دیکھو میرے گھر کا شیرخوار کتنا بدن کردار اور باشمور ہوتا ہے۔

صدائے استغاثہ کے بعد جب علی اصغرؑ نے اپنے کو جھوٹے سے گردایا اور خمیسہ میں کھرام برپا ہوا تو سر کا سید الشہداء و خمیسہ پر آئے — فرمایا، بہن زینت! یہ کھرام کیسا ہے — ؟ عرض کی بھیا؛ آپ کی آوازِ استغاثہ مُن کر علی اصغرؑ نے اپنے کو جھوٹے سے گردایا ہے۔ حسینؑ نے سر جھکا کیا۔ میں سمجھ گیا بہن، میرا اصغرؑ کیا چاہتا ہے۔ — اچھا لاؤ اب اسے میرے حوالے کر دو۔ بہن نے عرض کی بھیا؛ وہ کسی کی گود میں نہیں آ رہا ہے۔

حُسْنِ خیمه میں داخل ہوتے۔ اصغر کے قریب آئے۔ باپ نے کیا کہا، کون سمجھے ۔۔۔ ؟ اور بیٹے نے کیا سمجھا، کون جانے ۔۔۔ ؟ ہاں اتنا سب نے دیکھا کہ باپ نے ہاتھ پھیلائے اور کچھ سہک کر باپ کی گودی میں آگیا۔ عجب نہیں مقصد یہ رہا ہو، اصغر! چلو۔ میرے لال ۔۔۔ اب ستحاری بھی قربانی کا وقت آگیا۔ چلو بیٹا! اپنے ہاتھوں سے یہ آخری قربانی بھی بارگاہ احادیث میں پیش کر دوں۔

گودی میں لیا ۔۔۔ چلے ۔۔۔ درخیمہ کے قریب پہنچنے دیکھا، ماں سر جھک کائے کھڑی ہے ۔۔۔ اشارہ کو پہنچانا فرمایا، ریاب! خیر تو ہے۔ یہاں کیوں کھڑی ہو ۔۔۔ ؟ کہا، وارث کیا کروں ۔۔۔ دل نہیں مانتا ہے، آپ میرے لال کو وہاں لیے جائیں ہیں جہاں صبح سے جو بھی گیا ہے، والپس نہیں آیا۔ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکیں ۔۔۔ وہ ماں کیا کرے جسے ایک طرف شرم کھائے جائی ہے اور دوسری طرف بچکی محبت دل کو بڑھائے دے رہی ہے۔ نظروں سے اپنے لال کی بلاں میں دل نے دھیرے سے آواز دی۔ جاؤ اصغر جاؤ ۔۔۔ میں سمجھ گئی اپ یہ جھولا پھرنا آباد ہو گا۔۔۔ میرے لال! ایک دفعہ اپنی چاندی شکل پھر دکھادینا۔۔۔ بیٹا! محبت پیچیں کیے دے رہی ہے ۔۔۔ لیکن کیا کروں، میرے لال ۔۔۔ دین کا معاملہ ہے ۔۔۔ مولا کی زندگی کا سوال ہے۔ کاش تیری قربانی سے تیرے بابا کی جان نکھ جاتی ۔۔۔ دل میں ایسے ہزاروں خیالات اُبھر رہے تھے۔

جدیات کا ایک سیلاب سختا جو اُمّا چلا آرہا تھا۔ آنکھوں سے  
 آنسو کا ایک دریا تھا جو بہت اچلا حیار بہا تھا۔ حسین بھی آخر بیان تھے  
 مال کی یہ حالت دیکھ کر تڑپ گئے۔ مشیت کی پابندیاں۔ سر  
 جھکا کر فرمایا، لیکن رباب متحارا پچھر توکس ہے، شاید کسی کو اس کے حال  
 پر رحم آجائے۔ دھڑکنا ہوادل ٹھہرا۔ ہاں لشکر ہرید میں کوئی تو  
 صاحب اولاد ہوگا۔ کسی کے پہلو میں تولد ہوگا۔ کوئی تو میرے  
 پچھے کے نیلے ہونٹوں کو دیکھے گا۔ یہ خیالات ذہن میں گونج ہی رہے  
 تھے کہ ایک مرتبہ ہپر خیال کا رُخ بدلا۔ اسے جسے شہزادی لیلی کے  
 لال پر رحم نہ آیا۔ میرے اصغر پر کیا رحم آئے گا۔ جس نے عون و محمد کی  
 تصویر خاک میں مladی وہ میرے لال پر کیا رحم کرے گا۔ جس نے اُم فروہ  
 کے چاند کو گھوڑوں کی ٹالپوں سے پامال کر دیا وہ چھہ جینے کی جان کا کیا خیال  
 کرے گا۔ دل تڑپا۔ جذیات کا طوفان اُمّا، لیکن اللہ رے حوصلہ  
 خیسے میں اکبر بیٹھ گئیں۔ کچھ سہی، اب تو میں نے اپنے لال کو رخصت  
 کر دیا ہے۔ موال سے بہتر حجت کرنے والا کوں ہے۔ جب وہ قربان کرنے  
 پڑا مادہ ہیں تو میں کون سوچتے والی۔

کاشش! تاریخ کے پاس لفظیں سوتیں۔ کاش سورخ کے پہلو  
 میں مامتا بھرا دل ہوتا تو بتاتا کہ رباب کے دل پر کیا گز رہی ہے۔  
 لیکن انسوس۔ مقاتل خاموش ہیں۔ جذیات کی دنیا کچھ اشارے  
 دے رہی ہے۔ فضائیں سننا ٹاچھا یا ہوا ہے۔ حسین، اصغر کے لیے پانی

مانگ رہے ہیں — اور ایک آواز گونج رہی ہے: اقطع کلام الحسین  
 حرمہ! حسین کے کلام کو قطع کر دے۔ حرمہ بڑھا۔ دوش سے کمان  
 ترکش سے تیر نکالا — تیر چلہ میں جوڑا — حسین یہ سارا منظر دیکھ  
 رہے ہیں — ایک مرتبہ کمان کھینچی۔ گویا حسین کے سینے سے دل کھنچ  
 گیا — لیکن اللہ سے حوصلہ، ہاتھ کا پنے نہیں — تیر چلا —  
 اصغر کے لگے پر لگا۔ حسین کا بازو چھدا — باپ کا دل لوٹا —  
 ماں کی امیدوں پر پانی پھر گیا — بچہ یا پ کے ہاتھوں پینتھیب ہو گیا۔  
 حسین نے خونِ اصغر اپنے چہرے پر ملا — بیٹا! گواہ رہتا  
 قیامت کے دن یوں ہی رسول اللہ سے ملاقات کروں گا۔ نانا! یہ تحفہ  
 آپ کی امانت نے دیا ہے — تھوڑی دیر بھرے — رب کی یاد  
 آئی — اصغر کو لے کر چلے — ماں کو بچہ کا آخری دیدار کرا دیا جائے  
 درخیس تک آئے — دل تڑپا، واپس ہو گئے — پھر آئے —  
 رب کی بکسی نے پلٹا دیا — سات مرتبہ آگے بڑھے اور پچھے ہٹ  
 گئے — ہلتے ماں بچہ کی اس حالت کو کیسے دیکھے گی — ؟ آخر میں  
 دل کو سنبھالا — یہ سوچ کر بڑھ کر اب تو اصغر خست ہو چکے ہیں۔  
 ماں کو آخری دیدار سے کیوں محروم کیا جائے — درخیس پر آئے —  
 — آواز دی — رب اب — ! اپنے بچہ کو لے جاؤ — خیس میں  
 آواز پہنچی — رب دوڑی — لیکن قدم نہ اٹھے — مامتا نے  
 قدم تھام لیے — رب کہاں جا رہی ہو — ؟ کیا سمجھتی ہوا اصغر پانی

پی کر آئے ہیں ۔۔۔ ؟ کیا تمھارا بچہ زندہ وسلامت آیا ہے ۔۔۔ ؟  
کیا پھر اپنے لال کی چاند سی شکل دیکھنے جا رہی ہو ۔۔۔ ؟ قدم رُکے  
— شوق نے پھر سہارا دیا — گرتے پڑتے درخیلی تک پہنچیں۔  
مامتا نے گھبرا کے گودی پھیلا دی — حسین سے سر اٹھا کر  
دھیسرے سے عبا کادا من سر کایا — ماں نے خون کی چھینٹیں  
دیکھیں۔ دل دھڑکا — جھک کے غور سے دیکھا — ارے یہ تو گلے  
پرستیر کا نشان ہے ۔۔۔ یہ کُرتا لو خون میں ترہ ہے — بچہ تو مر جا کے  
— کیوں آقا ۔۔۔ ؟ آپ اصغر کو ماں سے ملانے کے لیے لائے  
ہیں ؟ میرے دارث — ! اصغر کو پانی مل گیا ؟ والی ! دشن کو میرے  
لال پر رحم آگیا — ؟ یہ کہتے کہتے ایک مرتبہ اصغر کی طرف مڑیں۔ مامتا  
نے فریاد کی — رباب ! تو نے تیروں کی بوچھاریں بھیجا ہی کیوں تھا۔  
خیال آیا میرا اصغر کیا کہے گا۔ گھبسر اکبر پکارا تھیں، یہاں ! مجھے نہیں  
معلوم تھا کہ اس سِن کے بچے بھی خر کر دیے جاتے ہیں۔

إِنَّا إِلَهُ وَرَأَنَا إِلَيْكَ وَهُوَ الْجَعُونَ

---

٩

أَعُوذُ بِإِلَهِي مِنَ الشَّيْطَنِ الرَّجِيمِ  
 بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ  
 عَلَى سَيِّدِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا  
 أَبِي القَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَاللَّهُ الطَّيِّبُينَ الطَّاهِرُينَ وَ  
 لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى أَعْدَاءِهِمْ وَقَاتِلِيهِمْ إِلَى لَوْمِ الظَّالِمِينَ  
 أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللَّهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ  
 وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ”

مالک کائنات کا ارشاد ہے۔ ”محمد صرف اللہ کے رسول ہیں“  
 ان کی حیات - ان کی موت - ان کا عمل - ان کا کردار ان کی عبادتیں  
 ان کی ریاضتیں، سب اللہ کے لیے ہیں۔ ان کی زندگی میں رسالت کے  
 علاوہ کوئی پہلو نہیں ہے۔ ان کے کردار میں کارِ رسالت کے علاوہ کوئی  
 گورنمنٹ نہیں ہے۔ ایسی جامع رسالت اور ایسی ہمہ گیر نبوت جس کا تصور بھی  
 مشکل ہے اور جب ایک عام انسان ایسی رسالت کا تصور کرنے سے

قادر ہے تو وہ رسول کا مرتبہ کیا سمجھے گا۔ رسول کو سمجھنے کے لیے رسالت کا سمجھنا ضروری ہے اور رسالت کے سمجھنے کے لیے جن شرائط کی ضرورت ہے ان کا کسی انسان میں فراہم ہونا مشکل نہیں بالکل ناممکن ہے۔

یہ ایک احسان تھا سر کا پرسالت کا، کہ انہوں نے عرفانِ الٰہی کے ذیل میں اپنی معرفت کا بھی طریقہ بتا دیا اور یہ دشواری جو آج ہمیں معرفتِ رسول کے بارے میں پیش آ رہی ہے یہ اس سے پہلے عرفانِ الٰہی کے بارے میں پیش آئی جس کا احساس خود سر کارِ دو عالم نے کیا اور ایک فقرے میں عرفان کے سارے راستے کھول دیے۔ عبدت کو سہارا مل گیا۔ بندگی تیزیز قدم بڑھانے لگی۔ عاجزی کے ماتھے پر آیا سوا پسینہ خشک ہو گیا اور سکونِ قلب نے آواز دی اس سے بہتر کوئی ذریعہ سکون نہ تھا۔ مرسلِ عظیم نے بارگاہِ احادیث میں دستِ بستہ آواز دی۔

”وَ هَا عَرَفْنَا لَكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ“

مالک! جو تیری معرفت کا حقِ عطا، وہ ادا نہ ہو سکا۔

تجھے ویسے نہ پہچانا جو حقِ معرفت تھا۔ الوہیت، عبدت کے ذہن میں کیونکر سمائی۔ مالک غلام کے تصورات کا کیونکر پابند بنتا۔ رب العالمین ذہنوں کی تراش خراش میں کیونکر آتا۔ یہ تیرا احسان تھا کہ تو نے اتنی ہی عاجزی کو قبول کر لیا اور یہ تیرا کرم تھا کہ تو نے ہماری طاقت سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کیا۔

مالک! تجھے اتنا ہی پہچانا ہے کہ تو ہمارے ذہنوں میں آنے والا

نہیں ہے۔ تو ہمارے دل و دماغ کا پابند نہیں ہے۔ اس سے زیادہ بندگی کے امکان میں کچھ نہیں ہے۔

مرسلِ اعظم کا یہ اندازہ دیکھ کر دھڑکتا ہوا دل بھر گیا۔ عقیدہ رسالت دل و دماغ میں اُتر گیا۔ قلب و نظر کو سکون کی منزل مل گئی۔ سارا اضطراب یہ تھا کہ بغیر پہچانے ہوئے ماں کسے؟ اور بغیر سمجھے ہوئے ایمان لائیں کسے؟ بھرا کر سمجھنا بھی چاہیں تو چھوٹے سے آئینہ میں اتنی بڑی تصویر بتائیں کسے؟ تاچیزِ دل میں مختارِ کل کا جلوہ نظر آئے کسے؟ ایک مرتبہ دل نے آواز دی۔ خبردار گھبرا نہیں۔ رسالت کو پہچانتا ہے تو رسول ہی سے درسِ معرفت حاصل کرو اور ان کی بارگاہ میں دی طریقہ عجز و نیاز اختیار کرو جاؤ۔ انہوں نے مالک کی بارگاہ میں اختیار کیا ہے۔ کل انہوں نے رب العالمین کی بارگاہ میں عرض کیا تھا۔ مالک! جو حق معرفت تھا ویسے نہ پہچان سکا۔

آج تم ان کی بارگاہ میں عرض کرو، سرکار! اپنا کل عرفان بھی ہے کہ ہم آپ کے عرفان سے عاجز ہیں۔ اور وہ حق معرفت نہیں ادا کر سکے جو غلامی کا فرض تھا۔ لیکن میرے سرکار دل مطمئن ہے کہ اتنا تو سمجھ لیا کہ آپ ہماری فنکر و نظر سے بالاتر ہیں۔ آپ کی منزل عرشِ اعظم ہے، ذہنِ لشکر نہیں۔ ہمارے ذہنوں میں ایک جھلک بھی آ جلتے تو ہماری نجات کے لیے کافی ہے۔ ہم وہ انسان نہیں ہیں کہ کچھ نہ پہچایا کے بعد سمجھی اپنے کو عارفِ کامل ہی سمجھتے رہے اور زندگی بھر رسالت کا

یقین نہ کرنے کے باوجود اپنے کو مسلم اول ہی تصور کرتے رہے۔ خداگواہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں شک نہ راہ نہیں پائی۔ ہمارے دل و دماغ میں یقین کے علاوہ کسی نے جگہ نہیں لی۔ ہماری زندگی آپ کی محبت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہم نے محبت کا وہ راستہ اختیار کیا ہے جہاں محبوب کی ہر محبوب شے محبوب ہوتی ہے اور اس کی کراہت باعثِ لفترت بن جاتی ہے۔ اسی لیے ہم نے آپ کے اہلیت سے زندگی کے ہر موڑ پر محبت کی اور آپ سے الگ ہو جانے والوں کو کبھی محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔

عزیزانِ محترم! یاد رکھیے کسی چیز کی معرفت کے چند وسائل ہوا کرتے ہیں، یا تو انسان نے اسے خود بنایا ہو کہ اس کے ایک ایک جزو اور ایک ایک گوشے سے باخبر ہو، یا کم از کم اس کی زگاہوں کے سامنے بنایا ہو کہ تمام پہلوؤں کو دیکھ بھال لیا ہو۔؟ اور اگر کچھ نہیں ہے تو کم از کم خود بھی اسی درجہ پر فائز ہو کر یہ جانتا ہو کر یہ درجہ کیا ہے۔ اور اس منزل پر فائز ہونے والا کیسا ہوتا ہے۔

سرکارِ دو عالمؑ کی ہستی کا عرفان اس لیے بھی مشکل ہے کہ انھیں یہ نے رسول بنایا نہیں اور نہ بنانے والے نے ہماری نگاہوں کے سامنے رسالت دی ہے اور اس سے بالاتر ہے کہ ہم خود صاحبِ رسالت بھی نہیں ہیں کریم پہچان سکیں کہ رسالت کیا ہے اور رسول کیسا ہوتا ہے۔ ایک بچہ ہمارے سامنے آکر یہ خبر دیتا ہے کہ ہم نے بی۔ اے پاس

کر لیا۔ تو ہم خوش ہو جاتے ہیں۔ انعام دیتے ہیں۔ تعریف کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں یہ خبر بھی نہیں ہے کہ یہ اے کیا ہوتا ہے اور یہ اے کا درجہ کتنا بلند ہے۔

ہم کسی بڑے عالم و خطیب و مقرر کی مجلس میں بیٹھے ہیں اور جب کوئی بات پستہ آتی ہے تو سبحان اللہ بھی کہتے ہیں لیکن کیا اس سبحان اللہ کا مقصد یہ ہے کہ ہم نکتہ کی ان تمام گھرائیوں تک پہنچ گئے جہاں تک ایک عالم کا ذہن پہنچا ہے۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔ بھر کیا وجہ ہے کہ ہم بسیار ختم تعریف کرتے ہیں اور وجد میں جھومنے لگتے ہیں۔۔۔

یہ سب عرفان کے وہی فطری طریقے ہیں جن کی طرف سرکارِ دنیا نے اشارہ کیا تھا کہ تعریف اس بات کی نہیں ہے کہ آپ نے نبی۔۔۔ اے پاس کر لیا۔۔۔ تعریف اس بات کی ہے کہ آپ نے وہ درجہ پالیا جو ہمیں نہیں ملا۔۔۔ تعریف اس کی نہیں ہے کہ ہم نے نکتہ سمجھ لیا۔۔۔ تعریف اس کی ہے کہ آپ نے وہ کچھ بیان کیا جس کی گھرائیوں تک ہمارا ذہن نہیں پہنچا، ورنہ اگر لپوری بات پہلے سے ذہن میں ہوتی تو ہم کبھی سبحان اللہ نہ کہتے۔۔۔ کبھی تحسین داؤرین کی آوازیں بلند نہ کرتے۔۔۔

پہچانا آپ نے۔۔۔ معرفت کی منزل کتنی سخت ہوتی ہے اور عرفان کے لیے کیا اہم شرائط درکار ہوتے ہیں۔۔۔ جب ہم اپنی محفل کے ایک درجہ کا اندازہ نہیں کر سکتے۔۔۔ اپنی ہی بزم کے ایک نکتہ کا ادراک نہیں کر سکتے تو ہمیں رسالت کا عرفان کیونکر ہوگا۔۔۔؟ ہم رسول

تو نہیں ہیں ۔ ہمارے سامنے رسالت تو تقسیم نہیں ہوئی ۔ رسول کو پہچاتا ہے تو اس کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ اس خدا سے دریافت کرد جس نے رسول بنایا ہے ۔ اس شریک نور سے پوچھو جس کی نگاہوں کے سامنے رسالت ملی ہے اس کے علاوہ کوئی مکمل تعارف نہیں کر سکتا ۔ اسی لیے سرکارِ دو عالم نے فرمایا تھا کہ :

وَ خَدَاكُمْ يَرَى إِذْ عَلَّوْهُ كُسْيَ نَنْهِيْسْ پَهْچَانَا وَ رَجَحَهُ  
عَلَّوْهُ أَوْ خَدَاكَ عَلَّوْهُ كُسْيَ نَنْهِيْسْ پَهْچَانَا ۔

عرفان کی یہ وہ بلند منزل ہے جہاں ذہنوں کا گذر نہیں ۔ دماغ پہنچ نہیں سکتے ۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہوں کہیں نبی کا وصی یہ اعلان کرتا ہے کہ میری بلندلوں تک کسی کے طائرِ فکر کی رسائی نہیں ہے ۔ اُس نبی کی منزل تک کون پہنچنے کا جس کی جوتیاں ساتوں آسمانوں کو روئند آئی ہوں اس کی منزلِ کمال کا اندازہ کون کرے گا ۔ جس کی عظمتوں کے سامنے کائنات کا سرخم ہواں کی بلندی کا اندازہ کون کریگا ۔ دنیا میں بالغہ اور غلوت سمجھے تو میں یہاں تک عرض کروں کہ جلالتِ مل کی منزل ہیں ہم ہی نہیں انبیاء و مرسیین بھی عاجز نظر آتے ہیں ۔ انسانی دنیا میں عاجز آنے کے بعد میں نے انبیاء و مرسیین کی محفل میں قدم رکھا ۔ ان سے پوچھوں میرے رسول کی منزل کیا ہے اور جیبِ الہی کی جلالتِ قدر کیا ہے ؟

حضرت عیسیٰ سے پوچھا ۔ آپ کا زمانہ قریب تر ہے آپ فرمائیں

اس رسول کا درجہ کیا ہے ؟ عیسیٰ نے آواز دی۔ میری حیثیت تو صرف ایک بشارت دینے والے کی ہے، میں کیا بتاؤں کہ اس کا مرتبہ کیا ہے۔ حضرت موسیٰ سے پوچھا، آپ فرمائیں، اس رسول کی عظمتیں کیا ہیں ؟ آواز آئی میری منزل کوہ طور ہے اور اس کا درجہ منزل نور۔ میں کیا بتاؤں کہ اس کا مرتبہ کیا ہے۔

آگے بڑھ کر حضرت ابراہیم سے پوچھا۔ خلیلِ خدا ! آپ بتائیں آپ کے اس پوتے کا مرتبہ کیا ہے۔ — خلیل نے آواز دی۔ میں کیا بتاؤں یہ میری خلقت سے ہزاروں سال پہلے سیدا ہوا ہے میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ اس کا نور میرے صلب میں نہ ہوتا تو نارِ غرود سے نجات نہ ملتی۔ حضرت نوح سے پوچھا۔ انھوں نے فرمایا، یہی تودہ ہے جس کی وجہ سے کشتی کو قرار ملا۔

حضرت آدم سے سوال کیا۔ اے بنی خدا ! آپ تو البوالبشر ہیں آپ فرمائیے، آپ کے فرزند کی منزلِ رسالت کیا ہے۔ — ؟ آواز آئی میں البوالبشر ہوں سید الانبیاء و نبیوں ہوں میں تو اُس وقت آپ وغل کے درمیان تھا جب یہ منزلِ نبوت پر فائز ہو چکا تھا میں کیا بتاؤں کہ اس کی منزلِ نبوت کیا ہے۔ ؟

جب انبیاء و مسلمین کی محفل سے بھی حسرہ و مہوگیا اور کوئی جواب نہ ملا۔ تو آیا مشکل کشا کے دروازے پر۔ اے مشکل کشا ! دو جہاں۔ آپ نے سب کی مشکل حل کی ہے میں بھی ایک عقدہ لیکر

آیا ہوں، اسے حل کر دیجئے — فرمایا، وہ کیا؟ میں نے دستِ ادب جوڑے اور عرض کی، آپ فرمائیں؟ اس آخری نبی کا مرتبہ کیا ہے؟ — آواز آئی، لیس یہ پہچانو کہ میں اس کا وصی اور تابع فرمان ہوں۔ تو جس کا وصی اتنا بلند ہو گا اس کا نبی کیسا ہو گا — ؟ تم انہیار و مرسیین سے کیا پوچھتے ہو۔ ابھی وہ وصیٰ نبی کی منزل تک نہیں پہونچے۔ تو نبی کی منزل کیا بتائیں گے۔

پہچانا آپ نے علیؑ کا مرتبہ — ؟ اب مجھے کہنے دیجئے کہ جب انہیار و مرسیین، علیؑ کے عرفان و ایمان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، تو اُمّت کے گنہگاروں کو یہ حوصلہ کہاں سے پیدا ہو گیا کہ وہ علیؑ کے ایمان و کردار کا مقابلہ کریں۔

علیؑ تو علیؑ — وہ تو صاحبِ منصب ہیں۔ وصیٰ نبی ہیں۔ امام وقت ہیں — امیر المؤمنین ہیں۔ صاحب امر ہیں۔ ساقی کوثر ہیں۔ میثُ عندها علم الکتب ہیں۔ فاتح خندق و خیر ہیں۔ — مجاہد بدر و اُحد ہیں — مولود کعبہ ہیں۔

انہیار و مرسیین علیؑ کی زوجہ کے مقابلہ میں نہیں لائے جاسکتے — میں کہتا تو دنیا کفر کافر کا فتویٰ لگادیتی، لیکن کیا کروں۔ خدا کا رسول ہے کہہ رہا ہے "اگر علیؑ نہ ہوتے تو میری بیٹی فاطمہ کا کوئی ہمسر نہ ہوتا۔ آدم ہوں یا کوئی اور۔"

آدم و غیر آدم کی وسعت دیکھئے اور پھر سیدہ کی عظمت کا اندازہ

لگاتی ہے — پوری کائنات میں کوئی ایسا نہیں ہے جو عظمتِ زمُر کا مقابلہ کر سکے۔ تو اے اربابِ کرم! ذرا غور کرو جس کی زوجہ ساری دنیا سے افضل و برتر ہو وہ شوہر کتنا بلند ہو گا — زوجہ پھر زوجہ ہوتی ہے اور شوہر پھر شوہر ہوتا ہے۔ اور وہ بھی کیسی زوجہ اور کیسا شوہر? یہ رشته وہ نہیں ہے جسے ہم نے اور آپ نے بغیر سوچے سمجھے کسی غرض سے قائم کر دیا ہو۔ یہ وہ رشته ہے جسے عرشِ اعظم پر دیکھ بھال کر رب العالمین نے قائم کیا ہے — اب فاطمہؓ دنیا وی رشته سے زوجہ علیٰ نہیں ہیں، بلکہ خدائی رشته سے ہیں۔ اور علیؑ دنیا وی اعتبار سے شوہر زمُر نہیں ہیں بلکہ مالک کے اہتمام سے ہیں۔

اہلِ دنیا سوچ سکیں تو سوچیں کہ کائنات میں کوئی اس شان کی زوجہ اور اس شان کا شوہر سپیدا ہوا ہے یا نہیں — اور اگر نہیں ہوا ہے تو اس کا مرطلب یہ ہے کہ اس گھر میں زوجہ بھی بے مثال ہے اور شوہر بھی بے نظیر۔

ظاہر ہے کہ اس بے مثل و بے نظیر رشته سے جو نسلِ عالمِ ظہور میں آئے گی وہ کسی بلند و بالا ہوگی۔

شاپید یہی وجہِ حقیقی کہ قدرت نے فاطمہؓ کو اولاد بھی لا جواب دی۔ نہ بہت میں حسین جیسا کوئی پیدا ہوا۔ نَخْلُقُ مِنْ حَمْنَ جیسا، نَحْوَصُدَه میں نیزبَت جیسا کوئی نظر آیا، نہ عزم میں اُمِّ کلثوم جیسا۔ ہر فرد ہر اعتبار سے کامل و مکمل۔

اب مجھے کہنے دیجیے کہ عظمتوں نے ساری کائنات کا چکر لگانے کے بعد آخر میں زیرِ اکی ڈیورھی پر ڈیے ڈال دیے اور اب صحیح قیامت تک بخیر فضیلت اُکھتر نے والا نہیں ہے۔ دنیا میٹتی ہے تو جنم جائے لیکن دریزِ ہر اکی عظمت بہرحال "قائم" رہے گی۔

بات کو آخری منزل تک پہونچانے سے پہلے ایک نکتہ کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ اسلام میں معرفت پر اس قدر زور کیوں دیا گیا ہے۔ ؎ خدا کی معرفت۔ نبی کی معرفت۔ امام کی معرفت۔ اور ہر معرفت کی انتہائی تاکید۔ حد ہو گئی کہ مولائے کائنات نے یہاں تک فرمایا کہ：“اَوَّلُ الدِّيْنِ مَعْرِفَةٌ” (دین کی ابتداء اُس کی (اللہ کی) معرفت ہے) (بیچ ابلاغ عن خطبہ) دین کی ابتداء ہی معرفت سے ہوتی ہے۔ معرفت نہیں تو گویا دین ہی نہیں۔ معرفت نہیں تو مذہب ہی نہیں۔

بات صرف یہ ہے کہ انسان کا کردار اُس کی معرفت ہی کے ساتھ میں ڈھلا کرتا ہے۔ جیسا عرفان ہو گا ویسا ہی کردار بھی ہو گا۔ ایک انسان کے بارے میں آپ طے کر لیں کہ یہ حقیر فقیر ہے تو نہ کبھی اس کی تعظیم کریں گے، نہ اس سے معروب ہوں گے اور نہ اسے خاطر میں لائیں گے۔ لیکن ایک آدمی کے بارے میں اگر فیصلہ کر لیں کہ یہ صاحبِ عظمت و حیالات ہے تو خواہ مخواہ اس کی تعظیم بھی کریں گے۔ اس کی بات پر عمل بھی کریں گے۔ بے توہی میں کردار مشکوک رہتا ہے اور انسان کا ضمیر مطمئن نہیں رہتا۔

یہ انسان قابلِ تعظیم ہے یا الائی تزلیل ۔۔۔ اس کی بات پر عمل ہونا چاہیے، یا نہیں۔ لیکن معرفت کے بعد یہ شبہات خود بخود دل سے نکل جاتے ہیں اور ضمیر کو ایک طرح کا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کردار سازی بھی انتہائی آسان ہو جاتی ہے۔

اسلام کا مشتاب بھی یہی تھا کہ ہمارے دائرة میں قدم رکھنے والا، بلا معرفت قدم نہ رکھے۔ آئے تو مکمل معرفت نے کرائے تالمذ عل کی منزل میں ہمیں تاکید تہ کرنا پڑے، بلکہ اس کا عرفان خود اسے عمل پر آمادہ کرے۔ یہی تواریخ ہے کہ جن لوگوں کو عرقان رسول حاصل تھا وہ اپنی زندگی کی ایک ایک سال س کو مرضی رسول کے ساتھے میں ڈھالے ہوتے تھے اٹھیں تو مرضی رسول دیکھ کر، بیٹھیں تو مرضی رسول پہچان کر۔ چیز تو رسول کی راہ میں اور مریں تو رسول کی راہ میں۔

تفصیلی بیان کا وقت نہیں ہے ورنہ ایسی بیشمار مثالیں پیش کی جاسکتی تھیں جہاں عظمتِ کردار اور بلندی عرقان کے یہ نمونے نظر آتے ہیں کہ یہاں تو صرف ایک منزل کی طرف اشارہ کرنا ہے جہاں کمال عرقان کا عالم یہ ہے کہ پھر اسوا شیر قبضہ شمشیر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ جب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اب مولا کی مرضی نہیں ہے۔

عباسی علدار اگر صرف سپاہی ہوتے اور صاحبِ عرفان تھے ہوتے تو کہاں کی جنگ تیسری محروم کو ختم ہو جاتی، لیکن یہ معرفت ہی کام جزو تھا کہ فرات سے خیمے ہٹ گئے اور غازی کی پیشانی پر نہیں آئے جب

میرے مولاکی یہی مرضی ہے تو میں کون بولنے والا ۔ ।

تاریخِ کربلا میں بیشمار مواقع آئے ہیں جہاں عباسؑ نے اپنے کمال عرفان کا ثبوت دیا ہے اور دنیا پر واضح کر دیا ہے کہ معرفت سے ہٹ کر بہادری اور ہوتی ہے اور معرفت کے ساتھ میں ڈھلی ہوئی شجاعت اور — بے معرفت جنگ کیا کرتے ہیں اور اہل معرفت جہاد —

جنگ و جہاد کے اس فرق نے کربلا کے سمجھنے کا اسرت کھول دیا کہ ادھر طاقت کے بھروسے پر جنگ ہو رہی تھی اور ادھر عرفان کے اعتماد پر جہاد یہی وجہ تھی کہ ادھر کا کوئی ایک بھی فرد ادھر نہیں گیا۔ لیکن ادھر کا حُسر معرفت حاصل ہوتے ہی ترپ کر حسینؑ کی خدمت میں آگیا ۔ ادھر کا زہیر رعنی کر مولاکی بارگاہ میں آگیا اور لویں آگیا کہ شب عاشور عباسؑ چیسے وفادار سے زہیر نے کہہ دیا۔ فرزندِ علیؑ ! آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے باپ نے آپ کو کس دن کے لیے جہیا کیا تھا۔

یہ سُنتنا احتمال کہ ایک مرتبہ شیر کو جلال آیا۔ غیرتِ ہاشمی خون بن کر گوں میں دور طے نہ لگی ۔ پشتِ فرس پرانگر ہائی لی۔ رکا میں ٹوٹ گئیں۔

فرمایا: زہیر! آج کیا شجاعت کا جوش دلاتے ہو ۔ ذرا اس رات کی صبح تو ہونے دو پھر دیکھنا، عباسؑ کیا ہے اور عباسؑ کی وفا کیا ہے ۔ ؟

لیکن عزادارو! یہ جذبہ دل کا دل ہی میں رہ گیا اور مشک سینہ کی ذمہ دار لویں نے غازی کو جنگ نہ کرنے دی۔ عباسؑ کی تلوار نکلتی تو دنیا خبر کی جنگ کا نقشہ دیکھتی ۔ مگر وہ غازی کیا کرے جس کے ہاتھوں ہیں

ذوالفقارِ حیدری کے بجائے مشک سکینہ ہوا اور نظر کے سامنے فوج  
و شمن کے بجائے بختیجی کی معصوم صورت ہو جو بار بار کہہ رہی ہو۔ چھا جنگ  
کا موقع نہیں ہے۔ چھا لڑائی میں دیرمت کیجیے گا۔ چھا آپ کی  
بختیجی بہت پیاسی ہے۔ اب گلے سے آواز نہیں نکلتی۔ زبان  
اینٹھکی ہے۔ ہونٹ خشک ہو گئے ہیں۔ اور عباش جب اس  
منظور کا تصور کر لیتے ہیں تو کلیج پانی ہو جاتا ہے۔

ساقی کوثر کافر زندہ رہے اور مولا کی لاڑکی پیاس سے بے جان  
ہو جاتے۔ عباس اس زندگی سے کیا فائدہ۔ بڑھو۔  
جلدی بڑھو۔ سکینہ کے شکوہ سے پہنچ پانی خیام حسینی میں پہنچ جائے  
علمدار نے مولا کو سلام کیا۔ اجازت لی۔ مشک و علم کو سنبھالا  
میدان کا رُخ کیا۔ گھوڑا درڑاتے ہوتے فرات پہنچے۔ مشکیزہ کو  
بھرا۔ چلو میں پانی لیا۔ پانی میں حسرتوں کی تصور زظر آئی۔ ایسا  
معلوم ہوتا تھا جیسے سکینہ سامنے کھڑی ہوئی کہہ رہی ہے۔ چھا جلدی چلیے  
پکے خمیر میں پیاس سے ترپ رہے ہیں۔ چھا دیکھیے! یہ آپ کی سکینہ بھی پیاں  
ہے۔ چھا! میرا بھیجا جھولے میں پیاس سے ترپ رہا ہے۔ عباس نے پانی  
کو چیننا، با تھوک دامن سے خشک کیا۔ وقار نے آواز دی۔ عباش!  
کہیں سکینہ تیرے ہاتھوں کی تری نہ دیکھو۔ بختیجی کو شکوہ ہو گا چھا کے  
ہاتھ میں پانی کی تری کیسے آئی۔ گھوڑے کا رُخ موڑا۔ اب شیر تراں سے  
بلندی کی طرف آ رہا ہے۔ چار مہار کا پہرا اور اس میں ایک علمدار۔

کوئی تلوار لیں کر طڑھا، کسی نے نیزہ سنبھالا، کسی طرف سے تیروں کی بارش شروع ہوئی۔ اور علیٰ کاشیرِ نہایتِ اطمینان سے صفوں کو چیز کر باہر نکل آیا۔ گھوڑے کو دوڑایا۔ یکے خمیرہ تک پہنچ جاؤ۔ ایک مرتبہ ایک ظالم نے چھپ کر وارکیا۔ ایک ہاتھ قلم ہو گیا۔ علم کو دوسرے ہاتھ سے سنبھالا۔ گھوڑے کو اور تیز کیا۔ راستے میں دوسرا شانہ ٹھیک قلم ہو گیا۔ عبائی نے پرواز نہ کی۔ تیزی سے خیمے کی طرف ٹڑھتے جا رہے ہیں، لیکن، اولاد والو! ایک مرتبہ ایک تیر مشکیزہ پر آکر لگا اور ہر پانی پہاڑا۔ ادھر خون پانی ہو گیا۔ شرم سے سر جھکا لیا۔ ہانے سکینہ کو کیا جواب دوں گا۔ بچی کو کیسے منہ دکھاؤں گا۔ مولا کی لادلی نے مجھ سے پانی کا سوال کیا اور میں پورا نہ کر سکا۔

سر کا جھکنا اتحاکہ ایک ظالم نے گُزِ آہنی مارا۔ مسجدِ کوفہ کی تاریخ دُہرانی گئی۔ عبائی کا سرش گافتہ ہو گیا۔ خون کا فوارہ جباری ہوا۔ گھوڑے کی طرف رُخ کر کے کہا؛ اے اسپ باوفا پلٹ حل۔ اب عبائی خیمے میں جاتے کے لائیں نہیں رہا۔ اب سکینہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ فرات کی طرف ٹڑھتے۔ چند قدم چلے تھے کہ طاقت نے ساتھ چھوڑ دیا۔ گھوڑے سے زمین کی طرف چلتے۔

اربابِ عزا! مجھ میں ہمت نہیں کہ لفظوں میں دُہرا سکوں۔ آپ سوچ سکیں تو سوچیں۔ یہ گھوڑے سے کون گر رہا ہے۔ وہ۔ جس کے ہاتھ نہیں ہیں۔ جس کے شانے قلم ہو چکے ہیں۔ جس کا سر گُز سے زخمی ہے

دل چاہتا ہے، آواز دوں۔ یا علیٰ! بخت سے آئے۔ عیاش کو سہارا  
دیجیے۔ آپ کے لال کے ہاتھ نہیں ہیں کہ زمین پر طیک سکے۔ آپ  
کے فرزند کا سرزخی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ کس نے سہارا دیا اور عیاش کس طرح زمین تک  
پہنچے یہ حیثیں کے کانوں میں ایک آواز آئی۔ مولا آئی۔ آواز کانوں سے  
ٹکرائی اور ہاتھ مرٹک پہنچ گئے۔ عیاش! اس آواز نے کمر لورڈی  
بھیا۔! حسین اکیلا رہ گیا۔ میرے علمدار! اب دشمن  
طفق دے رہے ہیں۔ حسین! محظا علمدار کہاں ہے۔؟ عیاش۔!  
بتاؤ میں کیا جواب دوں؟

حسین دل ہی دل میں بین کرتے رہے۔ ایک مرتبہ اٹھے کمر  
کو کس کے باندھا۔ میدان کا رُخ کیا۔ گرتے پڑتے چلے۔ راستے میں کوئی  
چیز اٹھا کر سینے سے لگاتے ہیں اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ پہاں تک کہ  
سر بانے پہنچے۔ سرزاں پر رکھا۔

عزادارو!۔ بتاؤں کیا سر۔ وہ سر جس پر گزر لگ چکا ہے  
— وہ سر جو دوپارہ ہو چکا ہے۔ وہ سر جس سے خون کا فوارہ جاری  
ہے۔ کیسے حسین نے زانو پر رکھا، اور کیسے اس منتظر کو دیکھا۔؟ اسے  
فرزند زہرا کا دل ہی جانتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عیاش نے سرہٹالیا۔ اللہ غلام کا سر اور آفات کا  
زانو۔ مولادیکھیں گے تو بیچین ہو جائیں گے۔ شاید اشارہ ہو کہ آقامیر سر

آپ کے زانوپر ہے، آپ کا سرس کے زانوپر ہوگا — ہمتلو میت نے آواز دی۔ عیاش بکھر اونہیں جب حیثیں گھوڑے سے گریں گے تو دکھیا مال آتے گی اور اپنے لال کا سرانچے آغوش میں لے لیگی۔ عزادارو! مجلس تمام ہو رہی ہے۔ بھائی بھائی میں گفتگو جاری ہے عیاش و صیتیں کر رہے ہیں — مولامیرے لاش کو خیتے تک نہ لے جائیے گا۔ بھیا۔! کیوں؟۔ اقتا! مجھے سکینہ سے شرم آتی ہے۔ میں نے بچی سے پانی کا وعدہ کیا تھا، لیکن پورا نہ کر سکا۔

میں کہوں گا عیاش! آپ نے حدوفا کا ثبوت دیا۔ اب یہ بچوں کا مقدار ہے۔ میرے شیر شرم کی کیا بات ہے۔ جائیے کم از کم بھتیجی آپ کی وفاداری کو دیکھ لو۔

لیکن عزادارو! شاید عیاش کا مقصد یہ بھی ہو کہ آقا ۲۳ سال کے جوان کا لاثہ ہے اور آپ کی لٹوٹی ہوئی کمر۔ یہ لاثہ کسے اُٹھے گا؟ مولا! مجھے فرات کے کنارے سیار ہئے دیجیے۔

وصیت تمام ہوئی۔ عیاش باس کرتے کرتے چوب ہوئے اور ہیں کی زبان پر مرشیہ آگیا۔

عیاش! آج سے وہ آنکھیں چین سے سوئیں گی جوتیرے خوف سے جاگا کر تھیں، اور بھیا! اب تیری بہنیں جاگیں گی، انھیں ستانفیض نہ ہوگا — عیاش! اب تیری سکینہ بھی نہ سو سکے گی۔

ہائے وہ شام غریباں کا ستاٹا — وہ زینت کا پھرہ۔ اور وہ

سکینہ کی بتا بی۔ چچا، تم کہاں ہو۔ ظالموں کے نزع میں اچھے  
مجھے کیسے نیند آئے گی۔ میں سوؤں لگی تو کوئی جھے سونے نہ دے گا۔  
میں آرام کروں گی تو ظالم مجھے جگا دیں گے۔ اور میں رونا بھی چاہوں گی  
تو شرملوں تازیاں لوں سے اذیت دے گا۔

عزیزو! جو سکینہ نے سوچا تھا وہی ہوا۔ شام غریب ایں  
کے سنائی میں جب بایا کو آواز دیتی مقتل میں آئی اور باپ کے لاثہ  
بے سر سے لپٹ کر رونا شروع کیا تو اشقیاء تازیاں نے لے کر آگے بڑھے  
اور چاروں طرف سے بھی کی پشت پر تازیاں لوں پر تازیاں نے پڑنے لگے۔  
بھی فرماد کرنے لگی چچا آپ کے نہ ہونے سے آپ کی سکینہ تازیاں لوں پر  
تازیاں لے کھا رہی ہے۔

”إِنَّا يَدْلُو وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِحُونَ“

---

(۱۰)

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَنِ الرَّجِيمِ  
 بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ  
 عَلَى أَفْضَلِ الْأَنْبِيَا وَالْمُرْسَلِينَ سَيِّدُنَا وَمَوْلَانَا  
 إِلَى الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ  
 وَلَعْنَةُ اللَّهِ الدَّائِمَةُ عَلَى الْبَاقِيَةِ عَلَى أَعْدَاءِهِمْ  
 أَجْمَعِينَ مِنَ الْأُفْرَاطِ إِلَى قِيَامِ لَيْلَةِ الدِّينِ  
 أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللَّهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكَوْنِيَّةِ  
 ” وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ”

” اور مسٹر صرف اللہ کے رسول ہیں ۔ ”  
 قرآن حکیم کے اس فقرہ کی روشنی میں آج یہ واضح کرنے ہے کہ راست  
 کیا ہے اور اس کا ذمہ دار یا کیا ہیں ۔ ؟

مالکِ کائنات نے انبیاء و مرسیین کا سلسلہ کیوں قائم کیا، اور  
 انبیاء و مرسیین نے کن ذمہ دار یوں کوئی طرح ادا کیا، اور پھر ان تمام ناسوں کا کیا

کے درمیان حصہ سروکائنات کی منزل اور آپ کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور آپ نے ان خدمتوں کو کس طرح ادا کیا۔

ایت الدین طور پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ رسالت کی ضرورت کیا ہے اور اس پڑھنے والی دنیا میں اللہ کی طرف سے نمائشوں کے آنے کا مقصد کیا ہے۔ تاریخِ انسانیت اس بات کی گواہ ہے کہ جب بھی کوئی نمائندہِ الٰہی آیا اور اس نے دنیا کی اصلاح کی کوشش کی، تو اہلِ دنیا نے اسے اس قدر ستایا کہ اکثر اوقات بارگاہِ احادیث میں فریاد کی اور کبھی کبھی بددعا کے لیے ہاتھا ٹھاکری۔ حضرت آدم کو یہی کا داع اٹھانا پڑا۔ حضرت نوح کو پھر کھانا پڑے۔

حضرت ابراہیم کو آتشِ نمرود میں جانا پڑا۔ حضرت موسیٰ کو غریبِ الوطنی کی زندگی گزارنا پڑی۔ حضرت عیسیٰ کو ساختمیوں کی بے ہبہی سے سابقہ پڑا۔ خود حضور سرورِ کائنات کبھی پتھر کھاتے رہے، کبھی کامٹوں پر چلتے رہے، کبھی سر پر کوڑا کرکٹ برداشت کرتے رہے اور اسی طرح ۲۳ سال تبلیغ کر کے دنیا سے رُخصت ہو گئے۔

سوال صرف یہ ہے کہ ایسے حالات میں کیا ضروری تھا کہ پروردگارِ عالم انبیاء و مسلمین کو بھیجا ہی رہتا اور اہلِ ستم کے لیے برابر ایک نشانہ ستم فراہم ہی ہوتا رہتا۔ ایک دو دور میں اہل زمانہ کی روشن دینکنہ کے بعد یہ سلسہ ختم کر دیا جاتا۔ دنیا را راست پر آتی یا نہ آتی، کم از کم اللہ والی توانِ مظالم سے محفوظ رہ جلتے اور انھیں تو ستمِ روزگار کا نشانہ نہ بنانا پڑتا۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا مصلحتِ الٰہی کو ریتِ العالمین ہی بہتر جاتا ہے لیکن ایک نکتہ پر

بھیں اور آپ کو بھی توجہ دینا ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی انسان کسی شخص کو اپنے گھر مدعو کرے اور دستِ خوان پر مختلف قسم کے سامان چُن دے۔ ان میں کھانے کا سامان بھی ہو اور ہاتھ دھونے کا پانی بھی۔ لذیذ غذا میں بھی ہوں اور مکھیوں کو مارنے کی دوا بھی۔ خود گھر میں بیٹھنے کی جگہ بھی ہو اور صاف شفاف بیتِ الخلاء بھی۔ تومیر بان کا اخلاقی فرض ہے کہ جہاں کو گھر کی پوزیشن سے باخبر کر دے اور اسے یہ بتا دے کہ رہنے کی جگہ کون سی ہے اور سونے کی جگہ کون سی۔ ملاقات کا مکرہ کون سا ہے اور بیتِ الخلاء کونسا۔ نہانے کی جگہ کھاں ہے اور ہاتھ دھونے کی جگہ کھاں۔ غسل کرنے کا حوض کون سا ہے اور منہ ہاتھ دھونے کا حوض کونسا۔ دستِ خوان پر کھانے کا سامان کیا ہے اور نائش کا سامان کیا۔ غذا کون سی ہے اور مکھی مارنے کی دوا کونسی۔

ایسا نہ کرنے سے اگر جہاں سے کوئی غلطی ہوئی اور اس نے مکان کو گندہ کر دیا۔ یا زہر یا دوا کا کمر گیا تو اس کی موت کی ذمہ داری خود اس پر عائد نہ ہوگی، بلکہ اس کا خونِ ناحق اس میز بان کے سر پر ہو گا جس نے دعوت میں بُلایا اور حالات سے باخبر نہیں کیا۔

یہ تو وہاں کے حالات ہیں جہاں جہاں خود بھی دنیا کا تجربہ رکھتا ہے اور مختلف چیزوں کو پہچانتا ہے۔ صرف مقامی سامان یا مقامی رسم و رواج سے باخبر نہیں ہے لیکن اگر جہاں کسی بات سے باخبر نہ ہو اور وہ مطلق طور پر ناقافت ہو تو میز بان کی اخلاقی ذمہ داری کیسی زیادہ بڑھ

جانی ہے اور اخلاقی دنیا میں جہاں کی موت میزبان کی طرف سے اقدام قتل  
درجہ پیدا کر لیتی ہے۔

عبد و مبعود، خالق و مخلوق اور خدا و بندہ کا رشتہ یہی ہے۔ مالکِ  
کائنات نے انسان کو عدم سے نکال کر وجود کی بستی میں پہنچایا۔  
بستی وہ جہاں اچھی بُری، مضر اور مفید، قابلِ استعمال اور ناقابلِ  
استعمال اشیاء کا دھیرگا ہوا ہے زمین سے آسمان تک مخلوقات  
کا ایک سلسہ ہے۔ ہوا سے لیکر فضائیک کار آمد چیزوں کا ایک سلسہ  
ہے اور جہاں ایسا ناواقف کہ اسے خود اپنی بھی خبر نہیں ہے۔ کوئی نام رکھ  
وے تو اپنے نام سے باخبر ہو جائے ورنہ اپنا نام بھی نہیں جانتا۔ کوئی غذا  
دیدے تو کھلے، ورنہ اپنی زندگی کا بھی انتظام نہیں کر سکتا۔ وہ یہ بھی  
نہیں جانتا کہ میرا بستر کیا ہے اور دستِ خوان کہاں۔؟ فطرت نے  
اس حد تک رانہمائی کی ہے کہ تیری ماں تیری پوری دنیا ہے۔ اسی کا  
سینہ تیرا دستِ خوان ہے۔ اور اسی کی گود تیرا بستر۔ اسی کا  
وجود تیرے آرام کی جگہ ہے اور اسی کا وجود تیرے ضروریات زندگی کی منزل  
لیکن ایک وہ منزل بھی آتی ہے جب انسان اس مکان سے منتقل ہونے  
پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس کی دنیا آغوش مادر سے چھپیل کر سینہ لگیتی تک پہنچ  
جائی ہے اس کا وجود صرف ماں سے متعلق نہیں ہے۔ اب اس کی دنیا  
صرف سینہ و آغوش مادر نہیں ہے بلکہ بطن لگتی اور سینہ زمین ہے۔

غینہت ہے کہ ضروریات کے ساتھ شعور نے باقاعدہ ترقی نہیں کی

اور جس پتے ضروریات میں ماں باپ اور تربیت کرنے والوں کا محتاج رہا اور انہوں نے اُسے نیک و بد سے آگاہ کرنے کے ساتھ دلوں کے ساتھ برداشت کا طلاقیت بھی سکھایا لیکن یہ سلسہ بھی کب تک ہے؟

دھیرے دھیرے شعور نے ترقی کی عقل پختہ ہوئی۔ اور اک کومال حاصل ہوا۔ اور ضروریاتِ زندگی نے خود محنتاری کی دعوت دی۔ بچہ صحنِ خانہ سے نکل کر میراںِ دنیا تک پہنچا۔ حالات نے ایک خاندان کے افراد کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا۔ اور ذہن نے مضطرب ہو کر فریاد کی۔ اب کون بتائے کہ اچھا کیا ہے اور رُبِّ اکیا ہے۔؟ اب کون سکھاتے کہ کیا کھاؤں اور کیا نہ کھاؤں۔ اب کون سمجھاتے کہ کہاں رسول اور کہاں نہ رسول۔ پیدا کرنے والے نے بندے کا اضطراب دیکھا۔ رحمت کو جوش آیا۔ اور ایک مرتبہ ندائے قدرت آئی۔ میرے بندے گھبرا ناہیں۔ جس نے کل سینہ و آغوشِ مادر کا پستہ بتایا تھا۔ جس نے کل صحنِ خانہ میں رینگنا سکھایا تھا۔ جس نے کل ماں باپ اور تربیت کرنے والوں کو جذریہ محبت و ہمدردی سے نوازا تھا۔ وہ آج بھی زندہ ہے اور تیرے حالات کو جانتا ہے اور مجھے پر رحم کرنے کے لیے تیار ہے۔ میرے بندے! اب تیری عقل کامل ہو گئی۔ ہے۔ تیرا شعور پختہ ہو گیا ہے۔ اب مجھے محنت کرنا پڑے گی۔ نظامِ فطرتِ محنت و مشقت چاہتا ہے۔ وقارِ انسانیت کسب و طلب کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اب وہ دن گئے جب دوسروں

کے سہارے زندگی گزار رہا تھا۔ اب وہ وقت نہیں رہا جب تو والدین کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہا تھا۔ جب تیری عقل ناقص بھتی، تیرا دماغ وسیلوں میں الجھر رہا تھا تو میں نے تجھے وسیلہ سی کے حوالے کر دیا تھا۔ تیرے والدین کا اصول تربیت سکھا تھا اور تجھے اسی وسیلہ میں گم رہنے دیا لیکن اب تو تیری عقل کامل ہو گئی ہے۔ اب تیرے شعور ہیں یہ بات آنے لگی ہے کہ وسیلہ اور ہے، اصل اور — راستہ اور ہے، منزل اور — والدین اور ہیں، رب العالمین اور — اب تجھے زندگی کا سابق ہم سے لینا ہے غیر سے نہیں۔ اپنا بیٹا ہم سے قائم کرنا ہے، دنیا سے نہیں ہم نے تجھے نیک وید سے آگاہ کرنے کے لیے اپنی طرف سے رسالت نبوت کا سلسلہ قائم کر دیا ہے، تاکہ تو مگر ابھی نہ ہوتے پائے اور میرے دامنِ الصاف پر دھستہ بھی نہ آئے پائے — تو بھی راہ راست پر لگ جائے اور میں بھی یہ کہہ سکوں کہ مہمان بلا یا ہے تو مہمان نوازی کا سارا انتظام بھی کر دیا ہے۔

یاد رکھیے! نبوت و رسالت اسی پیغام رسانی کا نام ہے جہاں اللہ والے، اللہ کے مہماںوں کو اچھے بُرے سے باخبر بناتے ہیں اور انسانوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ اس بھری پُری دنیا میں کون سی چیز قابلِ استعمال ہے اور کون سی چیز ناقابلِ استعمال۔ بندہ ان حقیقتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ اسے ان حالات کی مکمل خبر نہیں ہے۔ وہ اپنے ہی کو نہیں پہچانتا تو اپنے ضروریات کا کیا اندازہ کرے گا۔ یہ سہاری ذمہ داری ہے کہ ہم اسے راہ و چاہ سے باخبر کریں۔ ہم

انبیاء و مسلمین کو اسی لیے بھجو ہے کہ وہ تمہیں راہِ راست پر لائیں اور اپنے بُرے سے آگاہ کریں۔

اب یہ تمہارا الصاف تھا کہ تم نے اپنے مہربان و ہمدرد افراد کو بھی اپنے سماج میں جگہ نہیں دی اور انھیں طرح طرح کی اذیتیں دیتے رہے ان کا نظرِ اخلاق اتنا وسیع تھا کہ انھوں نے طرح طرح کی مصیتیں برداشت کیں لیکن تمہارا ساتھ نہیں چھوڑا اور تمہیں سیدھے راستے پر لگانے کی کوشش کرتے رہے۔

اسی منزل سے یہ فیصلہ بھی آسان ہو جاتا ہے کہ نمائندہ الٰہی کو کیا ہونا چاہیے ۔۔۔ کہ اگر نیک و بد سے باخبر کرنے والا خود بے خبر ہو گا تو اُس کی بات بے اثر ہو گی اور اگر سیدھے راستے پر لگانے والا خود بہر کا ہوا ہو گا تو اُس کی نمائندگی ایک دھوکا ہو گی، ہدایت نہ ہو گی۔ مالک سے بہتر اس حقیقت سے کون باخبر ہو گا۔

اُس نے جتنے انبیاء و مسلمین بھیجے ہر ایک کو عالم بھی پیدا کیا اور عصوم بھی ۔ اب جتنی اہم ذمہ داری ہو گی اتنی ہی زیادہ عصمت اور آگاہی ضروری ہو گی ۔ جس کی ذمہ داری ایک زمانے ۔ ایک دور ۔ ایک خاندان ۔ ایک قبیلہ سے متعلق ہو گی ۔ اس کی منزلِ کمال بھی اتنی ہی بلند ہو گی ۔ اور جو ساری کائنات کا صحیح قیامت تک کا ذمہ دار ہو گا۔ اس کی عظمتِ کردار اور بلندیِ منزل کا پتہ لگانے کے لیے عرشِ وُفرش کی وسعتوں اور صحیح قیامت تک کی ضرورتوں کا اندازہ لگانا پڑے گا ۔۔۔ اور جب تک یہ وسعتیں

ذہن میں نہ آجائیں مقامِ محمدیت کا اندازہ ناممکن ہے۔  
اس طرف کے بندے کہاں پیدا ہوں گے جو دنیا کی اصلاح کی خاطر  
اتئے مصائب کا سامنا کریں ۔۔۔ اور امت کے سدھارنے کیلئے کانٹوں  
پر چلنا گوارا کریں ۔۔۔ یہی طرف کی بلندی تھی جس نے کسی کو صفائی اللہ بنادیا  
تو کسی کو بخی اللہ ۔۔۔ کسی کو خلیل اللہ بنایا، تو کسی کو ذیح اللہ ۔۔۔ کسی  
کو کلیم اللہ بنایا، تو کسی کو روح اللہ ۔۔۔ اور جب سارے کمالات ایک  
منزل پر سرٹ کر آگئے تو جیبِ اللہ کا درجہ دیدیا ۔۔۔

عزیزانِ محترم ۔۔۔ ! جب رسالت و نبوت نیک و بد سے اگاہ  
کرنے کا نام ہے تو حب تک اس کائنات میں انسان زندہ رہیں گے اور  
نیک و بد کا شعور رہے گا، انیصار و مرسلین کی ضرورت بھی رہے گی ۔۔۔  
لیکن نہ جانے کیا مصلحتِ الہی ہے کہ انسان زندہ رہ گئے۔ نیک و بد کا  
وجود باقی رہ گیا، اور اس نے حضرت محمد مصطفیٰ پر نبوت و رسالت کا خاتمہ کر دیا  
دل چاہتا ہے کہ پوچھوں، میرے مالک ۔۔۔ کیا اب بندوں کے  
لیے نیک و بد کا امتیاز ضروری نہیں ہے ۔۔۔ کیا اب اچھے بُرے کافق  
بیکار ہو گیا ہے ۔۔۔ کیا شریعتِ اسلام متعطل کردی گئی ہے ۔۔۔ اور اگر ایسا  
نہیں ہے تو ہپر رسالت و نبوت کا سلسلہ کیوں بند کر دیا گیا ہے ۔۔۔ ؟

عجب نہیں قدرت جواب دے ۔۔۔ تو نے غور نہیں کیا جب تک  
دستِ خان پر نئے نئے چہماں آتے رہے۔ مختلف دل و دماغ کے لوگ مدعو  
ہوتے رہے۔ اس وقت تک ایک ایسے آدمی کی ضرورت رہی جو انھیں ان تمام

خصوصیات سے باخبر کرتا ہے۔ اور جب آنے والے باخبر ہو گئے ۔۔۔۔۔

اچھے بُرے کی تمیز کرنے کی صلاحیت والے ہو گئے۔ تو صرف اس آدمی کے ضرورت ہے جو انہیں غلط چیزوں کے استعمال سے روکتا رہے ۔۔۔۔۔ اور میں نے یہی انتظام کیا ہے کہ جب تک اونچے اپنے دماغ کے انسان پیدا ہوتے رہے۔ انہیں قدم قدم پر راہبری کرنے والے ہادی و رہنماء دیے گئے اور جب ذہن کمال کی اس منزل پر پہنچ گئے کہ ایک بیان ساری نسلوں کے لیے کافی ہو جائے تو اب صرف ان افراد کی ضرورت رہ گئی ہے جو نامناب چیزوں کے استعمال پر پابندی رکھتے رہی۔۔۔۔۔ یہ پیغام تو نہیں ہے لیکن پیغام ہی کا ایک جزو ہے۔۔۔۔۔ رسالت نہیں ہے لیکن رسالت ہی کا ایک شعبہ ہے۔۔۔۔۔ بھی وجہ ہے کہ میں نے غدیر خم کے میدان میں ولایتِ علیؑ کا اعلان کرنے کے لیے ” یَا أَيُّهَا النَّبِیُّ“ کہہ کر پکارا تھا۔۔۔۔۔ تاکہ دنیٰ کو اندازہ ہو جائے کہ رسولؐ دنیٰ سے جا رہے ہیں لیکن رسالت کی ذمہ داریاں نہیں جا رہی ہیں۔۔۔۔۔ پیغام رسانی کا کام ختم ہو چکا ہے لیکن تحفظِ رسالت کا کام باقی ہے اور اسی لیے علیؑ کی جا شیتی کا اعلان کرا رہا ہوں۔۔۔۔۔ اور اس اہمیت کے ساتھ کہ اگر نہیں کیا تو گویا کچھ نہیں کیا۔۔۔۔۔ اب مجھے کہنے دیجیے کہ غدیر خم کا میدان دُھری عظمتوں کا اعلان کر رہا تھا۔۔۔۔۔ ایک طرف یہ اعلان ہو رہا تھا کہ تکمیلِ دین نبیؐ کے ذمہ تھی اور وہ ہوئی اور دوسری طرف یہ اعلان ہو رہا تھا کہ تبلیغِ دین کا کام امامؐ کے ذمہ ہے اور اس کا سہرِ اعلیؑ کے سر باندھا گیا ہے۔۔۔۔۔

تکمیل و تبلیغ کے اسی فرق کا اندازہ نہ کرنے کا نتیجہ تھا کہ قومِ نبوت و امامت کا فرق بھی محسوس نہ کر سکی اور اسے امامت کی ذمہ داریوں کا بھی صحیح اندازہ نہ ہو سکا۔

مرسلِ عظیم اپنی تمام زندگی ... دینِ حق کی تبلیغ بھی کرتے رہے اور قوم کو اس پر عمل کرنے کے لیے بھی آمادہ کرتے رہے۔

اس وقت اس سے بچت نہیں ہے کہ کتنے راستے پر آئے اور کتنے نہیں آئے۔ اس وقت تو صرف یہ عرض کرتا ہے کہ مرسلِ عظیم نے اپنے فرض کو ادا کر دیا آیتیں آتی رہیں نبی سناتے رہے۔ پیغامات آتے رہے حضور پھر بخاتے رہے احکام نازل ہوتے رہے حضور قوم کو عمل پر آمادہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ غدیرِ خم میں تبلیغ کا سلسہ تمام ہوا اور دینِ الٰہی کو ستّ تکمیل مل گئی۔ اب اس کے بعد کوئی شریعت نازل ہونے والی نہیں ہے۔ کوئی تازہ حکم آنے والا نہیں، ہے امامت و خلافت کی ذمہ داری، انھیں احکام کا تحفظ کرنا اور انھیں پیغامات پر عمل درآمد کرنا ہے اور لبس۔

لیکن اربابِ کرم! ذرا سوچیں کہ امامت کی ذمہ داری کتنی سخت ہے کہ اب تک آیتیں متفرق طور پر نازل ہو رہی تھیں۔ احکام الگ الگ آرہے تھے۔ پیغامات دھیرے دھیرے آرہے تھے اور حضور ایک ایک کر کے قوم کو عمل پر آمادہ کر رہے تھے اور تاریخِ کوہاں ہے ایسی تدریجی تبلیغ میں بھی قوم کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اور ایسے رفتہ رفتہ عمل میں بھی بغاوت کے جذبات اُبھر آئے اور کرسی کو نبوت میں شک ہو گیا۔ کسی نے حضورؐ

کے دماغ پر حملہ کر دیا۔ تو اُب امامت کی ذمہ داریاں کتنی سخت ہوں گی کہ امام کو بیک وقت ان تمام احکام پر عمل کرنا ہے جنہیں رسول نے ۲۳ سال میں پیش کیا ہے۔ امام کو بیک وقت ان تمام مشکلات کا سامنا کرنا ہے جن کا سامنا حضور نے ۲۳ سال کی عمر تسلیع میں کیا ہے۔

یاد رکھیے! کہ اگر نبوت کے لیے پہاڑوں جیسا ثبات درکار ہے تو امامت کے لیے ہمالیہ جیسے عزم کی ضرورت ہے۔ اگر نبوت کے لیے سمندر جیسی وسعتِ صدر ضروری ہے تو امامت کے لیے طوفانوں جیسا زور و شور۔ اگر نبوتِ ثبات عزم کی طلبگار ہے تو امامت استقلال ارادہ کی مقاضی دنیا نبوت کو پہچانے تو امامت کی بلندی کا اندازہ ہو۔ رسالت کی معرفت حاصل کرے تو امامت کی جلالتِ قدرِ محجہ میں آئے۔ ذمہ داریوں کا یہی وہ پہاڑ تھا جسے ہر امام نے اپنے سر پر پٹھایا۔ فلائض کا یہی وہ انبار تھا جس نے ہر منزل پر مرکو بارِ دوش بنایا اور ہر امام وقت ہمیشہ قربانیوں کے لیے آمادہ رہا۔

دنیا ان ذمہ داریوں کی قدر نہ کر سکی لیکن رسالت کو تو معلوم تھا کہ میں نے کون سا بوجہ امامت کے سر پر رکھا ہے اور امامت نے میری کس مشکل کو آسان کیا ہے۔ اس لیے دنیا الزامات لگا رہی تھی اور رسالت مسلسل اعلان کر رہی تھی۔ علیٰ مجھ سے اور میں علیٰ سے ہوں۔ حسن مجھ سے اور میں حسن سے ہوں۔ حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔“

یہ نہ ہوتے تو رسالتِ منزل تعییل میں کامیاب نہ ہوتی۔ یہ نہ ہوتے تو

تبیلیغ رسالت ناتمام رہ جاتی۔ یہ نہ ہوتے تو دینِ الٰٰ تباہ و بر باد ہو جاتا  
بیہ نہ ہوتے تو قیامتِ اللہ ہی میں آ جاتی۔ یہ امامت ہی کا زورِ بازو تھا جس  
نے قیامت کو روکے رکھا اور خود بھی ”قائم“ رہی۔

لیوں تو امامت کا حوصلہ ہر منزل پر قابل دیدھا کو فرہ کی مسجد ہو، یا  
مذہب کا مرکان۔ سر شگا فقة ہو یا، بھگر کے کھڑے ہو جائیں، امامت کے  
استقلال میں فرق نہیں آیا، لیکن ان حوصلوں کا کمال کریلا کے میدان میں  
دیکھا جہاں باپ اپنے جوان بیٹے کو بُلا کر آواز دے رہا ہے بُنیٰ قَدَّم  
”بُنیَا الْكَبِيرَ بَعْدَهُمْ جَاءُوا“ میرے لال! حبیبِ رخصت ہو چکے مسلم مارے  
جا چکے، زُبیر نے ساتھ چھوڑ دیا۔ چاہئے والے نہ رہے۔ بُنیَا! دل چاہتا ہے  
کہ اب منھارِ اداغِ اُھٹاؤں — عون و محمد بہن کے لوزِ نظر ہیں۔ قاسم بھیا  
کی نشانی ہے، عیاش میرا علمبردار ہے، لیکن میرے لال! تم میرے فرزند ہو  
پہلے تم جاؤ، تاکہ مجھے بہن اور بھائی سے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ لیکن  
دیکھو اکبر! یہ ہے قربانی کی ذمہ داری، کہ میں متحیں بھیج رہا ہوں —  
ورنہ بیٹا! تم پر منھاری بھوپی کا بھی حق ہے۔ پہلے ان سے اجازت لے  
آؤ۔ اکبر باپ کا حکم پاکر خبیرہ میں داخل ہوئے۔ کون ہو رخ تھا جو اس  
داستانِ غم کو نقل کرتا — کس کے پہلویں دل تھا جوزینت کے  
جدیبات کا اندازہ کر سکتا۔ جذبات نے بڑھ کر تر جانی کی حالات نے اشارے  
دیے۔ ہجومِ مصائب نے قلبِ زینت کے جائزے کا موقع فراہم کیا۔ اکبر  
سامنے آ کے کھڑے ہوتے جس نے اٹھا رہ برس مشقوں سے پالا تھا، اس نے

سر اٹھا کچھرہ کو دیکھا۔ دل تڑپ گیا۔ ارے اس وقت میرے لال  
کے تیور ہی کچھ اور ہیں۔ اس وقت جیسے اکبر کچھ ملتگئے آئے ہیں، جیسے میرا  
لال کچھ سوال کرنا چاہتا ہے۔ ہاتے میں اکبر کے سوال کو کیونکر پورا کروں گی۔  
دل زینب تڑپ رہا ہے۔ کہیں اکبر نے پانی مانگ لیا تو کیا ہوگا؟  
میں نے تو بھی اپنے لال کے کسی سوال کو رد نہیں کیا۔ اگر آج اپنے اکبر کے  
مطالیہ کو پورا نہ کر سکی تو میرا کیا عالم ہوگا۔ دل دھڑکتا رہا اور ایک مرتبہ  
علیٰ کی بیٹی نے بہت کر کے لوچھہ ہی لیا۔ بیٹا کیسے آئے ہو۔ میرے اکبر  
کیا چاہتے ہو؟ بیٹا خاموش کیوں کھڑے ہو۔ بولو، بولو۔ بھوپی شار۔  
یہ بھوپی تیرے ہر سوال کو پورا کرے گی۔ اکبر نے سر جھکایا۔  
منظومیت نے آواز دی۔ بھوپی جان! آیا نہیں، بابا نے بھیجا ہے۔  
— بیٹا! اخیر تو ہے، کیوں بھیجا ہے؟ بھوپی اماں بابا نے مجھے سرکلنے  
کا حکم دیا ہے۔ میں میدان میں جا رہا ہوں۔ بابا کا حکم ہے کہ آپ سے  
بھی رخصت لوں۔ فرمائیے، اب کیا حکم ہے؟ آپ نے تو میرے  
کسی سوال کو رد نہیں کیا۔ فرمائیے بھوپی اماں، اب کیا خیال ہے؟  
زینب نے کلیجہ مکڑا لیا۔ بیٹا! مجھ سے مرنے کی رضاۓ آیا  
ہے۔ یہ زینب کا مقدار۔ اب زینب اپنے جوان کو خون میں  
نہیا یا ہوادیکھے گی۔ اب زینب اپنے اکبر کا ماتم کرے گی۔ بیٹا!  
پر کیا کہہ دیا؟ اکبر خاموش کھڑے رہے۔ بھوپی اماں جلدی فرمائیے۔  
وہ من بڑھتے چلے آرے ہیں۔ جوان بیٹا اور باپ پر طعنے سُن سکے یہ

یکے مکن ہوگا۔ ؟ پھوپی اماں! اگر آپ کا الٰہ میدان میں نہ گیا اور بابا پوئی آج چمگتی تو محشر میں کیا ہوگا۔ ؟ جب دادی اماں سوال کریں گی۔ زینب! بجھے الٰہ پسیا لاتھا اور میرا حسین پسیا رانہیں تھا۔ تو کیا جواب دیجیے گا؟ حسین پر صیبت کا ذکر سُنا تو زینب کا دل تڑپ گیا۔ فرمایا، جاؤ الٰہ جاؤ۔ بیٹا! اگر تمھارے قربان ہو جانے سے میرا حسین نجح جائے تو ہزار الٰہ قربان کر سکتی ہوں۔

پھوپی سے اجازت لے کر الٰہ نے بیبیوں کو آخری سلام کیا۔ خیمه کے دروازے پر آئے۔ پردہ اٹھا کر باہر نکلنا چاہا۔ ایک مرتبہ کسی نے بڑھ کے دامن تھاما۔ الٰہ کہاں جا رہے ہو؟ روایت میں کسی کا نام تو نہیں ہے لیکن میرا دل کہتا ہے کہ کسی بزرگ نے روکا ہوتا تو بازو پکڑا ہوتا۔ یہ دامن کیوں؟ عزادارو! کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ سن بہن نے آکر دامن تھام لیا ہو۔ بھیتا! تم میدان میں جا رہے ہو۔ ہمارا کون پرسان حال ہوگا؟ الٰہ! ہمارے حال پر کبھی رحم کرو۔ الٰہ پلٹے۔ خیمه میں آئے۔ دوبارہ رخصت ہوئے۔ پھر کسی نے روکا۔ راوی کہتا ہے کہ سات مرتبہ خیمه کا پردہ اٹھا اور گرا۔ الٰہ بار بار پلٹ کر خیمه میں گئے اور ایک مرتبہ سیدانہوں نے اپنے حلقة میں لے کر کہا۔ الٰہ! جاتے تو ہولیکن ہماری غربت کا خیال رکھنا۔ یہ سُنا تھا کہ الٰہ تڑپ گئے۔ پلٹ کر کہا۔ بیبیو! تمھیں اپنی غربت کا خیال ہے اور میرے بابا کی سیکسی کا خیال نہیں ہے۔ تجھے جلدی رخصت کرو۔ یہ کہہ کر

بڑھے اور اب پر دہ اٹھا کر لیوں نکلے جیسی کسی بھرے گھر سے بخازہ نکلتا ہے۔  
 باپ کے سامنے آئے۔ باپ نے پوچھا، بیٹا! رخصت لے آئے  
 ۔ ہے کہاں مال بابا۔ مجھے بھوپی نے رخصت کر دیا اور سیدانیوں نے  
 بھی رخصت دیدی۔ حسین نے دھرم کتے دل کے سامنے اکبر کے چہرہ  
 کو دیکھا۔ اور اسلام جنگ سچا کر گھوڑے پر بیٹھا کر کہا، جاؤ بیٹا حتاد کو  
 سونپا۔ لیکن دیکھو میرے لال! جب تک میرا اور تمہارا سامنا رہے  
 مُظہر کر دیجھتے رہتا۔ اکبر چھے۔ حسین دل سنبھالے بیٹھے رہے  
 چند لمحے گزرے تھے کہ ایک مرتبہ اکثر نے آسٹھ محسوس کی جیسے کوئی آرہا ہے۔  
 مُظہر کر دیکھا تو کیا دیکھا کہ ضعیف باپ کم پکڑے چلا آرہا ہے۔ رُک کر آواز دیکھا  
 بابا۔ آپ نے تو رخصت کر دیا تھا۔ یہ اب کیسے تشریف لائے۔  
 حسین نے دل پکڑ کر کہا، بیٹا! کاش تم صاحبِ اولاد ہوتے تو تمھیں یہ  
 اندازہ ہوتا کہ جوان بیٹے کو رخصت کرنے کے بعد باپ کے دل پر کیا گذتی ہے۔  
 جاؤ اکبر جاؤ۔ لیس حسین تمہارا دیدار کر چکا۔

اکبر چھے حسین بارگاہِ احادیث میں فریاد کر رہے ہیں۔ مالکِ بگواہ  
 رہنا۔ شبیہ رسولؐ کو نیچج رہا ہوں۔ اُسے نیچج رہا ہوں جس کے چہرہ کو  
 دیکھ کر نانا کی زیارت کیا کرتا تھا۔ مالک اب شبیہ پیغمبرؐ خاک میں ملتے  
 جا رہی ہے۔

حسین درخیسہ پر بیٹھے ہیں۔ اُدھر پالنے والی کا دل تڑپا  
 ایک مرتبہ فضہ کو بلاؤ کر کہا، فضہ جاؤ۔ اور جا کر درخیسہ پر پھر طری

ہو جاؤ۔ مولا کے چہرہ پر نظر رکھنا۔ جوان بیٹے کا معاملہ ہے اکابر  
پر کوئی وقت پڑے گا تو چہرہ کارنگ بدلت جائے گا۔ ایک مرتبہ فضہ نے  
دھڑکر خبر سنائی۔ بی بی۔ آپ کے اکابر کی خیر نہیں ہے۔ آقا کے چہرے  
کارنگ بدلت گیا ہے۔ شہزادی نے مولا کو بلالیا۔ آقا میرے اکابر کی خیر  
تو ہے۔ ؟ کہا، باں۔ اکابر سلامت ہے لیکن ایک نامی پرہلوان کا  
 مقابلہ ہو گیا ہے۔ وہ سیر و سیراب ہے اور میرا اکابر تین دن کا پیاسا ہے  
دعاء کرو، اللہ میرے اکابر کو فتح دے۔ پالنے والی کادل تڑپا۔ سید انیوں کو  
آواز دی۔ سببیو! آؤ محمد دکھیا پر ایک وقت پڑا ہے میں دعا کرنی  
ہوں، تم آمین کہنا۔ دعا شروع ہوئی۔ اے یوسف کو یعقوب تک  
پلٹانے والے! میرے اکابر کو پلٹا دے۔ دعا تمام نہ ہوئی تھی کہ فضہ نے  
اکابر خردی۔ بی بی آپ کالال میدان سے والپس آیا۔ دل ٹھہر نے ہی  
والاتھا کہ پھر خبر ملی۔ بی بی! اکابر پھر میدان میں گئے۔ شہزادی کل جسہ  
پکڑ کر بیچھے گئی۔ ہمیں میرا اکابر پھر میدان میں گیا۔ وکھیں! مقدار  
اب کیا دکھاتا ہے۔ ابھی اس اضطراب میں دل دھڑک رہا تھا کہ ایک مرتبہ  
خیسہ میں آواز آئی بنی ہاشم کے پتو! آؤ۔ ضعیف باپ سے جوان  
بیٹے کا جنازہ نہیں اٹھتا۔ خیر کا پردہ اٹھا۔ زینت نکلیں۔  
حسین نے جنازہ اکابر کو رکھا۔ سر پر ردا طالی۔ ارسے زینت۔ اتم  
کیوں آئیں۔ بھیتا، کیا کروں، تمھیں کیسے اکیلا چھوڑ دوں۔ لا او بھیا!  
میں پسے لال کو اٹھا لوں گی۔ میں نے بچنے سے گودی میں اٹھا یا ہے۔

حسین نے کہا، بہن والپس چلو۔ زینب کو والپس لائے۔ درخیزہ  
تک پہنچا یا۔

دل چاہتا ہے عرض کروں آقا! ابھی تو زینب کے سر پر چادر ہے  
ابھی خیسہ سے نکلنے میں کیا ف Hassan ہے۔ آقا اس وقت کیا ہو گا جعفر  
عاشور زینب جلتے خیسہ سے نکلیں گی۔ سر کے بال بکھرتے ہوتے منہ پر طمایخے  
مارتی ہوئی۔

وَأَهْمَدَ أُهْ وَأَعْلَيَاهُ وَأَحْسِنَاهُ  
وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ طَمَوا إِلَيْهِ مُنْقَلِبٌ يَنْقَلِبُونَ ۝

---

۱۱

أَعُوذُ بِاللَّهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَنِ الرَّجِيمِ  
 بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ  
 عَلَى سَيِّدِ الْأَنْبِيَا وَالْأَمْرِ وَالسَّلَامُ عَلَى الْعَالَمِينَ  
 سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا أَفِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٌ وَاللهُ طَبِيبُ  
 الظَّاهِرِينَ وَلَعْنَةُ اللهِ الدَّائِمَةُ الْبَاقِيَةُ عَلَى  
 أَعْدَاءِهِمْ لَجْمَعِينَ مِنَ الْأَنْتَارِ الَّتِي قَيَّمَ رَبُّهُمْ  
 الْدِينُ أَفَابَعَدُ فَقَدْ قَالَ اللَّهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ  
 " وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ " ،

( اور محمد صرف " اللہ کے " رسول ہیں۔ )

قرآن حکیم نے ان دو لفظوں میں سرکارِ دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ  
 صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کردار اور بلندی منزل کو یونہی سمیٹ دیا  
 جیسے انسانی جسم میں عالم اکبر سما یا ہوا ہو۔ یا جس طرح نقطہ باہ میں پورا  
 قرآن سمٹ آیا ہو۔

سر کارِ دو عالم کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ اس بات کا گواہ ہے کہ حضورؐ کی زندگی ایک عالمِ اکبر ہے اور قرآنِ حکیم کا یہ فقرہ اس کا جسدِ اطہر حضورؐ کا کردار قرآنِ عظمت ہے، اور یہ فقرہ اس کا نقطہ بارہ۔ یہ تو مالکِ کائنات ہی جانتا ہے کہ وہ کس بلند کردار والے کو مجھ تکھیتا ہے۔ اُس کی نظر میں رسول ہونے کے لیے کس طہارتِ نفس۔ بلندیِ اخلاق۔ عظمتِ کردار۔ ۔۔۔ ثابت عزم اور شدت استقلال کی ضرورت ہے لیکن یہاں تک حضورؐ کی زندگی کے جائزہ کا تعلق ہے، تاریخ کے اور اقne نشاندہی کی ہے کہ آپ نے تبلیغِ دین اور پیغامِ الٰہی کے پروپنجانے میں کیا اہتمام برنا ہے اور کون شدائد و مصائب کا سامنا کیا ہے۔

رسالت ایک عظیم منصب ہے جسے خالقِ کائنات اپنے منتخب بندوں کو عطا کیا کرتا ہے اور جس پیغام کی جتنی زیادہ اہمیت ہوتی ہے اتنی ہی عظیم شخصیت کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ خدا کا آخری پیغام صبح قیامت تک رہنے والا تھا۔ خدا نے اس کے لیے جس نبی کا انتخاب کیا اُسے کمالات بھی اس قدر عطا کر دیے کہ عمر دنیا تک ترقی کرنے والا انسان بھی اس منزل تک نہ پہنچ سکے اور کسی دور کے انسان کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ محمدؐ عربی کا مرتبہ ہم سے کم تر تھا اور ان کا دین ہمارے ترقی یافتہ ذہنوں کے لیے ناکافی ہے۔

انسان تو انسان کل کا مسلمان بھی معراج پیغمبرؐ کا ذکر سُن کر تعجب کیا کرتا تھا کہ آسمانوں میں راستہ کیسے بنائی گا۔ چند لمحوں

میں اتنی طویل مسافت کس طرح طے ہوئی ہوگی۔ آسمانوں کے شکاف کے بغیر اور کیسے گئے ہوں گے ۔ وہ سواری کیسی ہوگی جس میں اتنی تیز رفتاری پانی جاتی ہو ۔ وہ جہر میں کیسا ہو گا جو انسان کے تمام راستوں سے یوں باخیس ہو کہ چند لمحوں میں سیر کر اکروالیں لے آئے ۔ ۔ ۔

عظمیت کی نظر اور کوتاہی علم اور اس پر مزید لپنان کا فلسفہ ۔ ۔ ۔

فلسفہ لپنان سے مرعوبیت نے ذہنوں کو مفلوج بنادیا تھا اور مسلمانوں نے عاجز اگر مراج روحانی کا سہارا لیا۔ آیتِ قرآنی کو جھٹلا تین توایمان جائے۔

فلسفہ لپنان کی مذہب کریں تو علم کہاں سے آئے ۔ تیجہ یہ ہوا کہ بھرا سبٹ میں ایک درمیانی راستہ نکال لیا۔ حضور مراج میں گئے ضرور مگر جسم کے ساتھ نہیں، بلکہ سماءوات کی ساری سیر حضور کی روح اقدس کا کارنامہ تھا، جسم اطہر تو فرشِ خواب پر تھا، اور یہ مطلب اتنا قیمتی معلوم ہوا کہ اس کی تائید میں حدیث بھی تیار کیں اور روح جہ کی زبان سے گواہی دلوادی کہ حضور استری استراحت پر تشریف فرماتھے۔

مسلمان کو کیا خبر کہ اس کی کوتاہی نظر، مذہب کا کیا حشر کرے گی؟ لپنان کا فلسفہ حقائقِ اسلام کو کس ٹھکانے لگائے گا۔ اسے تواریق قائم کرنے سے مطلب اور حیدر ہم و دینار مل جائیں تو حدیثیں وضع کرنے سے غرض ۔ میں بھی سوچا کرتا تھا کہ جب مسئلہ مراج اتنا مشکل ہے، راتوں رات سیر کی منزل اس قدر مشوار ہے کہ امتحانِ قرآن کے حلقوں سے بھی نہیں اُترتی تو مالکِ کائنات کو لے جانے کی ضرورت ہی کیا تھی، اور اگر لے ہی گیا تھا تو بات

کو پر پڑہ راز میں رکھا ہوتا نہ مسلمانوں کو اطلاع ہوتی، نہ ذہن بہتے فلسفہ کے سائل اُبھتے اور نہ عقائد خراب ہوتے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ مالکِ کائنات نے گیا اور عجیب انداز سے لے گیا۔ لے گیا تو اسنا چھپا کر کہ پاس والوں کو کبھی خبر نہ ہوئی اور اعلان کیا تو ایسا ڈنکے کی چوٹ پر کہ صحیح محشر تک آئے والوں کو خبر ہو جائے۔

آج دوڑِ حاضر کی بے پناہ ترقیاں نہ ہوتیں تو مذہب کا فلسفہ سمجھدیں سمجھی نہ آتا۔ انسان اس طرح آگے نظر بھتا تو حقائقِ مذہب لشنا ہی رہ جاتے۔ یہ ترقی دنیا کا احسان ہے کہ حقائقِ مذہب کھلتے جا رہے ہیں اور تائیدِ مذہب کو مواد ملمبا جا رہا ہے، یہ اور بیات ہے کہ ترقی کرنے والے ان حقائق سے یہ خبر ہیں اور ان کی نفس پرستی اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ مذہب کے اذکار ہی میں عافیت ہے اور توحید و رسالت سے فرار ہی میں آزادی کا تحفظ ہے۔

اگر آج معراجِ پیغمبر کا تذکرہ نہ ہوتا اور دنیا ترقی کرتے کرتے چاند سورج کی متلوں کو طے کر لیتی۔ انسانی قدم چاند کی زمین کو اپنی جو تیوں سے روشن دیتے تو انسانی دماغ کہاں ہوتا اور کیا اسے یہ کہنے کا موقع نہ ہوتا کہ انسان ترقی یافتہ انسان مکہ مدنبر کے راستوں پر اونٹ پر بیٹھ کر چلتے والے کی پیروی نہیں کر سکتا۔ اونٹ پر سبیٹنے والا صحرائشینوں کے لیے نظامِ زندگی پیش کر سکتا ہے، فلک پیمائی کے لیے نہیں۔

یہ احسان سخا معاراجِ پیغمبر کا، کہ اس نے ناطقہ بند کر دیے۔ زیابوں

پر پھرے لگا دیے اور آواز دی خبردار۔ امیرے جیبیٹ سے مقابلہ نہ کرتا۔ بزرگوں وسائل اور آلات فراہم کر کے چاند تک جانا تمہارا کام ہے اور بُراقِ حذبِ مجتہ پر بیٹھ کر عرشِ اعظم کی سیر کر کے چشم زدن میں پلٹ آنا محمد کا کام ہے۔

دنیا مراجِ پیغمبر پر بیان لائے یا نہ لائے اتنا تو مانتا ہی پڑے گا کہ قرآنِ حکیم میں اس مراج کا تذکرہ ہے۔ اس کے دامن میں سفرِ پیغمبر کی داستان ہے اور یہ خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جس دُور کا انسان سیرِ سماوات کے بارے میں سوچنے سے قاصر تھا اس دُور میں قرآنِ حکیم اس سیر کی رو داد سنایا تھا۔

اربابِ نظر۔ ! فیصلہ کریں جو خدا جہالت کے دُور میں اتنی عظیم داستان سناسکتا ہے۔ جو مالک انسانی بے خبری کے ماحول میں ان خصوصیات کی اطلاع رکھتا ہے، اور دنیا کے لیے یہ اطلاعات فراہم کر سکتا ہے، کیا اس میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ اپنے جیبیٹ کو راتِ آسمانوں کی سیر کرے۔

پیشہ رآنِ حکیم کا مجھے تھا کہ اس نے دنیا کے افرا و انکار کی پرواہ کیے بغیر قصہ مراج کو بیان کر کے اپنے دامن میں محفوظ کر لیا۔ میرا سابقہ مکہ مدینہ کی قوم سے ہوتا تو میں ان کے جدیبات کا خیال کر کے واقعہ پر پردہ ڈال دیتا، لیکن مجھے صحیح مختصر تک رہنا ہے اور پوری نسل انسانی کو چیخ کرنا ہے، اس لیے میں نے واقعہ کو محفوظ کر لیا ہے۔

اور آج بھی میرا علاں ہے کہ سیر قمر کرنے والے اور ہیں اور سیر عرش کرنے والے اور۔ چاند پر جانے والے اور ہیں اور چاند کو دُنکڑے کرنے والے اور۔ ستاروں کی منزلوں کو دھونڈھنے والے اور ہیں اور ستاروں کو اپنی دلیوری پر بلانے والے اور۔ کائنات کی زنجروں میں جکڑے ہوئے انسان اور ہیں، اور کائنات کا اقتدار اپنی تتمہی میں رکھنے والے اور۔ یاد رکھو! جو اپنے نفس کا سیندھ ہوتا ہے وہ پابندِ کائنات ہوتا ہے اور جو خدا کا بندہ ہوتا ہے وہ حختارِ کائنات۔ جو خدا نے بے نیاز کو مجھول جاتا ہے وہ ساری کائنات کا فقیر ہوتا ہے اور جو کتر مخفی کو پالیتا ہے وہ جناب امیر ہوتا ہے۔

ایک معراج اور شقِ القمر ہی کا ذکر نہیں، حیاتِ پیغمبر کے چھوٹے چھوٹے واقعات بھی اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ خدا کا رسول عظیموں کی اس منزل پر فائز ہے جہاں تک پہنچنا ذہنِ انسان کے لیے ناممکن ہے چہ جاتی کہ جسمِ انسانی۔

دُورِ حاضر کی مددوں کن ترقیوں میں ایک ترقی یہ بھی ہے کہ انسان نے ایسے آلات ایجاد کر لیے ہیں جن کے ذریعہ لوپے مکان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر لیتا ہے سیر قمر کے بعد یہ بات زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتی لیکن ان کے دل سے لوچھیے حصیں آسمانوں کی سیر ایک پہمیلی معلوم ہوتی ہے۔ اور جو چاند اور سورج کے فاصلوں کو ایک افسانے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ کہ آسمانوں کی سیر تو ٹوپی بات ہے زمین پر بھی

ایسا کوئی واقعہ ناممکن ہے۔ جب لاپوری زمین کیسے اٹھائی جائے گی۔ اور اگر زمین اٹھائی جائے گی تو عمارت کس طرح قائم رہے گی اور اگر عمارت قائم رہ جائے گی تو راستہ کس طرح طے ہوگا، اور اگر راستہ طے ہو جائے گا تو دوسری عمارت نصب کس طرح ہوگی۔؟

اس طرح کے بے شمار خیالات ذہنوں میں گونج رہے ہیں اور انسان ہر ترقی کو ایک مضحمدکہ کا درجہ دے رہا ہے۔ مجھے اس سے بحث نہیں ہے کہ یہ واقعات صحیح ہیں یا غلط۔ دنیا انہیں مانتی ہے یا نہیں۔ مجھے تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جب آج کے ترقی یا فتنہ دور میں یہ یا یہیں مضحمدکہ خیز نظر آتی ہیں، تو کل کے جاہلیت زدہ ذہنوں میں یہ بات کسی رہی ہوگی اور ان کے سامنے ایسی گفتگو کس قدر دشوار رہی ہوگی۔ لیکن اللہ رے صلوات پیغمبر کہ حضور نے کل کے حالات میں انہیں جاہلی ذہنوں کے سامنے ایک اشارے سے درخت کو پینے پاس بگالیا اور پھر والپس بھی کر دیا تاکہ آنے والی دنیا انہی ترقیوں پر نازدہ کر سکے اور اسے اندازہ رہے کہ جو کام آج تم آلات و وسائل کی مدد سے کر رہے ہو کل اس سے بالآخر کام خدا کا رسول اپنی روحانی طاقت سے کر چکا ہے۔ وسیلہ کا محتاج انسان ہوتا ہے اور وسائل سے یہ نیاز نہ سندہ رب العالمین۔

عزیزانِ محترم۔! انسانی ترقی اس منزل پر آچکی ہے جہاں انسان ہر مخلوق کے احساس و شعور کا اندازہ کرنے لگا ہے۔ کل یہ بات مسلمان میں تھی کہ جمادات و نباتات میں شعور کا گذرنہیں ہے۔ یہ بات حیوانات کے ساتھ

خصوص ہے اور منزلِ حیوانیت پر پہنچنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے لیکن آج کے انسان نے سائنسی آلات کی مدد سے یہ اندازہ بھی کر لیا ہے کہ دنیا کی ہر مخلوق میں ایک طرح کا شعور پایا جاتا ہے۔ پتھر بھی درد و رنج کا احساس رکھتے ہیں اور نباتات کو بھی اپنے دُکھ درد کا اندازہ ہوتا ہے۔ بعض پتھروں سے پانی کے قطرے کا ٹپکنا علامت ہے کہ اس کے احساس کی گرمی قطرہ اشک بن گئی ہے۔ درختوں میں طرح طرح کے تغیرات کا پیدا ہونا دلیل ہے کہ موسم کے تاثر نے اس میں یہ انقلاب پیدا کیا ہے۔ ممکن ہے کہ انسان حیوان کے شعور میں اتنا فرق ہو کہ انسان کو اپنے شعور کا شعور بھی ہوتا ہو اور حیوان میں شعور کے شعور کی طاقت نہ ہو۔ لیکن اسے بھی کون جانتا ہے جب کہ خود قرآن مجید نے پتھروں کے احساس کی تعریف کی ہے اور ایک مقام پر پتھر کو انسانی دل سے بہتر قرار دیتے ہوئے ارشاد کیا ہے کہ ”پتھر سے تو پانی بھی نکل آتا ہے لیکن انسان کے دل پر تو اتنا بھی اثر نہیں ہوتا۔“

دوسرے مقام پر خود اپنی عنصرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ ”اگر میں اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نمازی کر دیتا تو وہ بھی خون خدا سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔“

خوب خدا کا تصویر کیا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے ذریعہ اللہ نے اس کی قوتِ احساس کا اندازہ کرایا کہ اسے (سپارڈ کو) دُکھ درد کا اندازہ ہے۔ اُردو کے عظیم شاعر غالب نے اسی نکتہ کی طرف

اشارہ کیا تھا: ۵

رُگ سنگ سے ٹپکتا وہ لموکہ پھرنا تھتنا  
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

مقصد یہی ہے کہ غم انسان کو دیا گیا ہے تو اس کے دل پر اثر نہیں ہوتا  
ورنہ یہی اگر شرار بنا کر پھر کو دیدیا جاتا تو وہ خون کے آنسو رو تا اس لیے کہ  
اس کی قوتِ احساس بہت سے انسانوں سے بہتر ہے۔ حیرت ہے کہ ایسے  
حالات میں بھی انسان قلت احساس کو "سنگدی" سے تغیر کرتا ہے۔ میرا  
خیال تو یہ ہے کہ اگر پھر کو زبان دیدی جاتی اور اسے بھی اپنے خیالات کے  
اظہار کی اجازت ہوتی تو وہ ایسے انسانوں کے خلاف احتیاج کرتا جن کی  
قوتِ احساس جمادات و نباتات کے برائی بھی نہیں ہے۔

غالب کے کلام کو شاعرانہ تصورات کا درجہ دیا جاسکتا ہے لیکن اتنا  
ضرور مانتا پڑے گا کہ غالبت اتنا عظیم تصوّر بھی کہیں سے لیکر آتے ہیں۔ ان کا  
ذہن بھی مافوق کائنات نہیں ہے کہ انہوں نے ایک اتنا عظیم تصوّر پیش کر دیا۔  
.... یہ ان کے لاشور کی آواز ہے جسے انہوں نے خود محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو  
اکثر نقاد ان سخن محسوس نہیں کر سکتے۔

عذریزانِ محروم — ! کل جب فراقِ رسول میں درخت کے گریہ کی  
بات کہی جاتی تھی تو اہل دنیا مذاق اڑایا کرتے تھے اور آج جب سائنس نے  
اس مضحک کو حقیقت سے قریب تر کر دیا ہے تو ہر تازہ ذہن تسلیم کرنے کے  
لیے تیار ہے اور ہر دماغ تائید کرنے کے لیے آمادہ ہے۔ اب اندازہ ہوتا ہے

کہ روحانی کمالات درختوں کو بھی متاثر نہ سکتے ہیں ۔ تو اب مجھے کہنے دیجیے کہ جب رسول اکرم کے عارضی فراق میں درخت صدائے نالہ میٹنے کر سکتا ہے تو جب رسول اکرم کا فرزند صحابے کر بلا میں بھوکا پیا سا شہید ہو گا تو کیا تعجب ہے کہ اسman سے خون برس رہا ہوا اور زمین سے جو تھپر اٹھایا جاتے اس کے نیچے خونِ تازہ جوش مارا ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات نے حسین کا سوگ منایا ہے اور مالک کائنات نے پوری دنیا کو زہرا کے لال کا سوگوار بنادیا ہے۔ کیوں نہ ہوتا۔ زہرا نے اپنا بھرا گھر راہِ خدا میں دے دیا، لیکن یہ حسرت لیکر دنیا سے گئیں کہ کاش میں زندہ رہتی تو اپنے حسین کا ماتم کرتی ۔ ابو الحسن رہتے تو اپنے حسین پر روتے ۔ بابا رہتے تو اپنے لواب سے کاغذ منانے ۔ میراحش ہی رہتا تو اپنے بھائی کا جنازہ اٹھاتا ۔ لیکن اسے کیا کیا جاتے کہ تسلی امامت درمیان میں ہے اور سب کو پہلے رخصت ہونا ہے ۔ آخر میں ایک حسین کو تنہا کر بلا کے میدان میں رہ جانا ہے جس کے لیے زہرا کو فکر ہے ۔ بابا ۔! جب کوئی نہ رہے گا تو میرے حسین پر روتے گا کون ؟ مرسلِ اعظم نے تسلی دی، بیٹی ۔! خدا ایک قوم کو سیدا کر لیگا جس کے مرد، مردوں کا ماتم کریں گے اور اس کی عورتیں، عورتوں پر آنسو بھائیں گی۔

میرا دل چاہتا ہے عرض کروں حضور ۔! بیٹی کے دل کو سن جالیے، یہ قوم کی کیا ضرورت ہے؟ فرمادیجیے زینب رہے گی، ام کلثوم صفتِ عزا

بچھائے گی۔ میرا سیدِ سجاد ماتم کرے گا۔ لیکن عزادارو! ایسا نہیں ہوا پیغمبرؐ نے قوم ہی کا نام لیا۔ تو اب دو ہی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ یا تو زہرا کا مقصد تھا کہ قیامت تک یہ ماتم کس طرح قائم رہے گا اور بابا نے تسلیم دی کہ ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہیں گے جو اپنی زندگیوں کو تیرے لال کے لیے وقف کر دیں گے۔

کہیے تو عرض کروں شہزادی! آئیے اور اگر دیکھئے۔ آج اس قوم کا ہر حصہ، اس قوم کی ہر خالون اور اس قوم کا ہر بزرگ و جوان آپ کے لال کا ماتم کر رہا ہے۔ شہزادی! انھوں نے کبھی اپنے عزیزوں کے غم میں سرو سینہ نہیں پیٹا۔ انھوں نے کبھی اپنے باب کے ماتم میں خون نہیں بہایا۔ انھوں نے کبھی اپنے رشتہ داروں کا لیوں غم نہیں منایا۔ یہ صرف آپ کے لال کا ماتم ہے کہ ہر ماں اپنے بچے کے جسم سے بہتا ہوا خون دیکھ کر خوش ہو رہی ہے۔ ہر باب اپنے فرزند کو اپنے سے جدا کرنے پر تیار ہے۔

شہزادی۔ اب اس قوم کے دن، دن نہیں رہے۔ اس کی راتیں آرام کے لیے نہیں رہیں۔ اسے صرف آپ کے لال کے ماتم کی دھن ہے۔ اس کے ذہن پر اپنا گھر نہیں ہے کہ بلا ہے۔ اس کی نظروں میں اپنے لال نہیں ہیں کہ بلا کے نوبت ہیں۔ اس کی مانیں بچوں کو دیکھتی ہیں تو انھیں رباب کی اُجڑی گود نظر آتی ہے۔

عزاداران حسین! مرسلِ اعظم کا ایک مقصد یہ یہی ہو سکتا ہے کہ بیٹی زہرا! تیری زینب تو رہے گی۔ تیری ام کلثوم تو رہے گی۔

تیرا سچا د . . . . تو رہے گا۔ لیکن انھیں رونے نہ دیا جائے گا ان کے ماتم پر پابندی ہوگی، ان کی آنکھوں سے آنسو گریں گے تو اشقيا رانھیں نوک نیزہ سے اذیت دیں گے۔

شاپیدی وجہ تھی کہ مسلِ عظیم نے مردوں کے ساتھ عورتوں کا نام بھی لے لیا گویا مقصود ہی یہ تھا کہ فاطمہ تیری بیٹیاں کیا ماتم کریں گی۔ ان کی حالت تو خود ایسی ہوگی کہ آنے والی قوم ان کی مظلومیت کا ماتم کرے گی۔

اربابِ عزا۔ مجلس کا سلسلہ تمام ہو رہا ہے۔ اج ہمیں اور آپ کو زہرا کے لال کا ماتم کرنا ہے جسین کی دُکھیا مال رو مال نے کرائگئی ہے اور ایک ایک ماتم دار کی آنکھوں سے یہتہ ہوتے آنسوؤں کو دیکھو رہی ہے۔ اللہ رے ذمہ داری زہرا خود بھی آنسو بہائیں اور سوگواروں کے آنسو بھی جمع کریں۔ فاطمہ کریلا میں کتنا روشنی کون جانتا ہے کسی کا زہرا جیسا دل اور حسین جیسا لال ہو تو اندازہ کرے کہ ایسے لال کی شہادت پر ایسی ماں کا کیا حال ہوتا ہے۔ بہاں تاریخ کریلا نے چند منتظر بیان کیے ہیں۔

آپ برابرستہ رہتے ہیں کہ عاشور کی رات جب فرزندِ رسول مقتل کی طرف گئے تو ایک تشییع سے کسی بی بی کے رونے کی آواز آئی۔ آپ نے پہچانا، وہ کون بی بی تھی، اور کیا کرو رہی تھی؟ عجب نہیں مادر حسین بیچ سے آئی ہوں۔ میرے لال! کل تو اسی زمین پر گھوڑے سے گئے گا۔ میرے حسین!

آتیرے مقل کی خاک کو اپنے بالوں سے صاف کر دوں۔ حسین میرے آنسو کس طرح تھیں، بیٹا! کل یہاں میرا باغ اُجر ط جائے گا۔ حسین کے جسم پر میں نے ملکی سی

تکلیف برداشت نہیں کی کہ اس کا جسم تیروں پر رہے گا۔ حسین گلے کے میں  
نے بوسے لیے ہیں اس پر شمر کا خبر چلے گا۔ واحسیناہ واحسینا۔  
حسین پلٹ کر خمیہ میں آئے۔ چلے ہنسے والا دروازہ پر پیٹھا ہے ایک  
مرتبہ بہن نے کہا، مجھیا! آپ نے اپنے ساتھیوں کو آزمالیا ہے۔ ایسا نہ ہو  
کہ آپ کو میدان میں تنہا چھوڑ کر چلے جائیں۔ حسین کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ  
صحابی دوڑا ہوا جمیع اصحاب میں آیا۔ جبیب، زُہیر، مسلم! غضب سو گیا۔  
دخترِ زُہیر کو ہماری وفا پر اعتماد نہیں ہے۔ چلو حیدری چلو۔ چل کے زینب کو ہانی  
وفا کا اعتماد دلائیں۔ اصحاب اُٹھئے۔ تلواریں نیام سے نکالیں۔ نیام  
کو توڑ کر مچینیں کا۔ درخیمہ پڑا کہ آواز دی۔ علیؑ کے لال! دخترِ زُہیر سے کہہ  
دیجیے، یا تو ہماری وفا پر بھروسہ کریں یا ہمیں اجازت دیں کہ ہم اپنے گلے اپتے  
ہاتھ سے کاٹ کر مچینیک دیں۔ ہم اس دن زندہ رہ کر کیا کریں گے جب دخترِ زُہیر  
کو ہماری وفا پر اعتماد نہ ہو گا۔

حسین نے سمجھایا، زینب کا دھڑکنا ہوا دل ٹھہرا۔ عاشور کی رات  
تمام ہوئی تیکن، عزادارو! حسین زینب نے اصحاب کے یہ حوصلے دیکھے ہوں  
گے جب اس نے عصرِ عاشور بھائی کو رخصت کیا ہوگا کہ اس کے دل پر کیا گلزاری  
ہوگی۔ کیا دل نے نہ پکارا ہوگا۔ حبیب، مسلم، زُہیر! اب کہاں ہو؟  
میرا حسین اکیلا رہ گیا ہے اور عجب نہیں شہزادی نے مقلل کارخ کر کے آواز دی  
ہو۔ الکبڑا اُو، عون و محمد اٹھو، قائم کہاں گئے۔ عباش کیا تم بھی سو گئے۔ بمحارا  
مولانا کیسلا رہ گیا۔

اللہ رے حوصلہ زینت۔ بھائی کو لکھیج سے لگایا، لگے کے بوسے یئے،  
رخصت کیا۔ گھوڑے پر سوار کیا۔ عز ادارو! کبھی کسی بہن نے اپنے بھائی کو  
مرنے کے لیے رخصت کیا ہے۔؟ یہ زینت ہی کا لکھیج تھا کہ اپنے رامھول سے  
گھوڑے پر سوار کر دیا جس میں مقلد کی طرف چلے۔ زینت کا دل تڑپا۔ بھیا۔!  
بہن نے سوار تو کر دیا ہے لیکن دل تڑپ رہا ہے کہ اگر تمھیں اُترنا ہو گا تو کون  
سوہرا دے گا۔

ایک مرتبہ فضلانے کے بلا میں آواز گوئی۔ زینت گھبرا نہیں۔  
جس نے چیکی پس پس کر پالا ہے وہ اپنی گودی میں سر کھلنے لے گی۔ مدینہ سے  
رسول آئیں گے۔ بحث سے علی آئیں گے یقین سے زہرا آئیں گی، اور اپنے حسین  
کو سوہرا دیں گی۔

روایت کہتی ہے کہ جس وقت شمر کا خبر حسین کے لگے پر چل رہا تھا، تو  
ایک آواز گوئی بھی میرے لال، میرے حسین تھے میری نگاہوں کے سامنے  
ذبح کر دیا۔ بیٹا! تجھے پانی بھی نہیں ملا۔ ہائے حسین۔ ہائے میرے لال۔

”إِنَا مِلَّهٖ وَإِنَا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔“

---

۱۲

أَعُوذُ بِإِلَهِ الْمِنَّٰتِ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ  
 بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ  
 وَالثَّحِيَّةُ وَالإِكْرَامُ عَلَى أَشْرَفِ الْأَنْبِيَاءِ وَسَيِّدِ  
 الْمُؤْسَلِينَ وَاللَّهُ الظَّاهِرُ<sup>۱</sup> طَاهِرُ<sup>۲</sup> إِنَّمَا يَنْهَا  
 الدَّارِمَةُ عَلَى أَعْدَادِهِمْ وَقَتَلَهُمْ أَجْمَعِينَ مِنْ  
 الْأُوتُرِ الْأَوْتُرِ قِيَامًا لِوَهْمِ الْأَدِيْنِ أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ  
 اللَّهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ  
 ”وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ“

(”اور محمد صرف (اللہ کے) رسول ہی۔“)

مقامِ محمدیت کا حامل، عظمت رسالت کا مالک، اذی الجہاتیہ کی دوپہر کو ولایتِ علیؑ کا اعلان کر کے اپنی رسالت کو منزلِ تکمیل تک پہونچ کر ۲۸ صفر ۱۴۰۶ھ کی صبح کو ابدی نیند سو گیا۔ کاظموں پر چلنے والے کے زیر قدم گلشنِ جنت آگیا، پتھر کھانے والے پر گھولوں کی بارش ہونے لگی خس خاشک

برداشت کرنے والے کے گرد جنت کی بہاریں طواف کرنے لگیں ۔  
ملکے کے مشرکین اور مدینہ کے منافقین کے مظالم برداشت کرنے والے  
کو جواہر رب العالمین مل گیا۔ اب اسلام ہے اور منزل تعیل علی بن ابی طالب  
ہیں اور ترویج دین مبین ۔ نسل ابوطالبؑ ہے اور حفظِ ارسالت کی  
ذمہ داری ۔

مولائے کائنات علیؑ بن ابی طالبؑ نے دین کو منزل تعیل سے آشنا  
بنانے میں بے پناہ مصائب کا مقابلہ کیا۔ ۲۵ سال تک گوشہ نشین رہنا  
پڑا تو رہے۔ جمل و صفين و نہروان کے میدانوں میں آنا پڑا تو آئے ۔  
منافقین کی رشیم دوانیوں کا سامنا کرتا پڑا تو کیا۔ اور کسی منزل پر تبلیغ  
دین سے قدم پھیپھی نہیں ہٹایا ۔

یہ علی علیٰ السلام ہی کا گلیچہ تھا کہ جا گیر چھپن کی ملوانی نہیں اٹھائی ۔  
یہ علی علیٰ السلام ہی کا حجگہ تھا کہ گلے میں رسمی کا چہندا پڑا کیا اور سر نہیں اٹھایا۔  
یہ علی علیٰ السلام ہی کا حوصلہ تھا کہ سر دریار زہر اکی توہین کی گئی اور بد دعا  
کے لیے با تھنہیں اٹھائے ۔ یہ علی علیٰ السلام ہی کا دل تھا کہ گھر میں  
اگ لگادی گئی اور حملہ نہیں کیا۔

علیؑ وزیرؑ کے انھیں حوصلوں کی وارث بن کر ایک نسل سامنے آئی  
جن میں دو دن کے ذمہ دار اور دو بھائیوں کے مقصد کی پاسیانِ ضمانت  
دین امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے حصے میں آئی اور مقصد حسنؑ و حسینؑ کی اشاعت  
زینتؑ و ام کلثومؑ کے حصے میں آئی ۔

کائنات میں کسی انسان نے دین کی خاطر اتنی قربانیاں نہیں دیں جتنی قربانیاں فاطمہ زہرا کو دینا پڑی ہیں۔ خلیلِ خدا نے ایک اسماعیلؑ دیا تھا۔ آدمؑ کو ایک بابل کا داغ اٹھانا پڑا تھا۔ ایوبؑ کو اپنے ذاتی مصائب اٹھانا پڑے تھے۔ یونسؑ کو خود شکم ماهی میں رہنا پڑا تھا۔ عوسمیؑ کو خود دریائے نیل سے گزرنا پڑا تھا۔ عیسیؑ کو خود ستم بیہود کا ساتھ کرنا پڑا تھا۔ لیکن فاطمہ زہراؑ ہم اپنے مصائب تو ایک طرف گھر جلا، وارث کے گلے میں رسی بندھی۔ جاگیر چینی گئی۔ حق سے حسرہ دم کیا گیا۔ پسلیاں توڑی گئیں۔ دروازہ پہلو پر گرا یا گیا۔ شکم میں محسن کی شہادت ہوئی۔

اور اس کے علاوہ مالک نے فاطمہؓ کو چار اولاد دی۔ چاروں کو دین خدا پر قربان کروایا۔ حسنؑ کو زہر دغا کے لیے پیش کر دیا۔ حسینؑ کو خبر جفا کے لیے دیدیا۔ زینبؑ و ام کلنومؑ کو بازاروں اور درباروں کے لیے پیش کر دیا۔ اور آواز دی میرے مالک! اگر تیرے دین کو یہ بھرا گھر درکار ہے تو مالک! میرے حسنؑ کا کلیجہ حاضر ہے۔ میرے حسینؑ کا کلکا حاضر ہے۔ میری زینبؑ کی روا حاضر ہے۔ میری ام کلنومؑ کے بازو حاضر ہیں۔ میرے محسن کی شخصیتی جان حاضر ہے۔ فاطمہؓ یہ سب کچھ دیدیے گئی لیکن تیرے دین کی بربادی برداشت نہ کرے گی۔ اس دین کیلئے میرے بابا کی زندگی مصائب کا شکار بنتی ہے، اس دین کیلئے میرے وارث نے ہم صیبت برداشت کی ہے۔ اس کیلئے میری ملکۃ العرب مال نے فاقعے کیے ہیں۔ اس دین کے لیے میرے

بزرگوں نے درختوں کے پتے چبا کر زندگی گذاری ہے تو میں اس کی بڑائی کیونکر برداشت کروں گی۔

میرے مالک! تو گواہ رہنا یہ مصائب دلوں پر پڑتے تو شب تاریک کی طرح سیاہ ہو جاتے۔ یہ مصائب پھر اپر پڑتے تو ٹکڑے ہو جاتے۔ یہ مصائب خاصاً خدا کو دیدیے جاتے تو دل لرز جاتے۔ لیکن یہ تیری رہرا ہے جو شکوہ نہیں کرتی۔ تیری کنیز ہے جو فریاد نہیں کرتی۔

مالک! گواہ رہنا۔ زہر سہیش خاموش نہیں رہے گی۔ تبلیغ دین کی منتیں ختم ہو جائیں گی، تو زہر الجولے گی اور تیری کنیز تیری بارگاہ میں فریادی بن کر آئے گی۔

مالک! میں اپنی داستان میدان محشر میں سُناؤں گی جب میرے ہاتھوں میں میرے عباس کے کٹے ہوئے ہاتھ ہوں گے، میری گود میں میرے اٹنگر کا لاشہ ہو گا۔ میرے پاس میرے حسین کا یروں سے چھلنی پر اس ہو گا۔ اور میں تیرے عرش کا پایہ پکڑ کر فریاد کروں گی۔ لے عادلِ حقیقی۔ فاطمہ تجوہ سے انصاف چاہتی ہے، فاطمہ نے تیرے لیے سارا گھر لٹا دیا ہے۔ مالک! اب میں کچھ نہیں چاہتی۔ صرف ایک التجا ہے کہ میرے لال کے عزاداروں کو معاف کر دے۔

مالک! ہاتھوں نے اس کا ماتم کیا ہے جس کے وارث اس کا ماتم نہیں کرسکے۔ مالک! ہاتھوں نے اس کی صفتِ عزا بچھائی ہے جس کی

مال کر بیان کے میدان میں نہ تھی کہ اپنے لال کی صفتِ عزا بچھاتی۔

مالك - ! یہ انھیں کے آنسو ہیں جبھیں اپنے رومال میں جمع کر کے لائی ہوں — یہ انھیں کے خونِ جگر کے قطرے ہیں جبھیں تیری بارگاہ میں سمیٹ کر لائی ہوں۔

عزادارانِ حسین ! کون اندازہ کرسکتا ہے کہ اس وقتِ محشر کا کیا عالم ہوگا — فاطمہؓ کے بال گھلیں گے تو کیا منتظر ہوگا۔ ہمیں تو اتنا یاد ہے کہ کل وفاتِ پیغمبرؐ کے بعد جب ان بالوں کے گھلنے کا ذکر کراگیا تھا تو مسجدِ سپتیہؓ کی دیواریں بلند ہو گئی تھیں۔

..... دخترِ پیغمبرؐ نے سچ کہا تھا کہ اگر یہ رہا تب دونوں پر پڑتے تو وہ رالوں کی طرح سیاہ ہو جاتے — اس کا اندازہ تو کرم بلا کے میدان میں ہوا — جب حسینؑ کے گلے پر خبرِ حل رہا تھا اور زمین کو زلزلہ تھا — آفتاب گہن میں چھپا ہوا تھا... فرات کی موجیں سرپٹک ہی تھیں — سیاہ آندھیاں چل رہی تھیں اور آسمان کے ستارے گریاں چاک کر کے باہر آگئے تھے — زین خون اُگل رہی تھی اور آسمان سے خون کی بارش ہو رہی تھی۔

کاش کوئی باشعور ہوتا جو اندازہ کرتا کہ جب اس کائنات کی یہ حالت تھی — جب زمین و آسمان زیر و زبر ہو رہے تھے تو اس فاطمہؓ کا کیا حال ہوگا جس نے حسینؑ کو پالا تھا — اس تجی کی کیا حالت ہو گی جس نے حالتِ نماز میں اپنی پشت پر بھٹایا تھا — اس علیؑ کے دل پر کیا گزری

ہو گی جس نے مجتھے سے اس لگے کو لو سہ دیا تھا۔

روئے والو ! دل کو سنبھال سکو تو شناوں — اور آنسوؤں  
کو روک سکو تو تمھارے ذہن کو اس منظر کی طرف رے جلوں — ایک لمبے  
کے لیے تصور کر دکھ جسین کے لگے پر چلتا ہوا خجہ دیکھ کر کائنات مغلب  
ہو گئی توجہ خمیرتہ عصمت میں آگ لگی ہو گئی — جب زہرا کی یہیوں کے  
سروں سے چادریں چھپیں ہوں گی — جب سکینٹ کے منظر پر طماقچے لگکے ہوں  
گے، تو اس کائنات کا کیا حال رہا ہو گا۔

اور الیسی آندھیوں کے درمیان — ایسے گھن کے عالم میں جب  
رات آئی ہو گئی تو وہ رات لکتنی تاریک رہی ہو گئی، اور اس رات میں ان  
بیکس سیدانہوں کا کیا عالم ہو گا جن کے جدے ہوتے خیموں میں شمعیں کیسی میدوں  
کے چراغ بھی نہیں ہیں — جن کی خاکستر شدہ قناتوں پر نور قمر کیسا  
نور نظر کا سایہ بھی نہیں ہے — ہائے وہ شامِ غربیاں کا ستانہ —  
وہ کربلا کا جنگل اور وہ جنگل کا سکوت — وہ خیموں کے جبلے کی بلکی بلکی  
روشنی — وہ چاروں طرف وارثوں کے لاثے — وہ اصغر کا  
خالی جھولا — وہ دربار کی گود کی گرمی — وہ لیلی کا دھڑکتا ہوا  
دل — وہ اُم فروہ کا اضطراب — وہ قاسم وعوان محمد — اور  
عبداللہ کی یادیں اور وہ بیکس شہزادیاں — وہ جلتی ریتی اور وہ  
عابدِ ہمیار —

کون ہے جو دل اسے دے — ؟ کون ہے جو پاس بانی کرے — ؟

کون ہے جو بیکسی کے عالم میں لٹی ہوئی شہزادیوں کے دلوں کو سہارا دے؟  
کوئی نہیں — صرف کربلا کی خاک ہے جو اُڑا کر سروں کا پردہ  
کمر ہی ہے۔ رات کی تاریخی ہے جو چہروں کو نامحربوں کی نگاہوں سے بچانے  
ہوتے ہے۔ بیکسی ہے جو ماتم کر رہی ہے۔ تنهائی ہے جو آنسو سہاری ہی ہے۔  
— ستاٹا ہے جو لونج خوانی کر رہا ہے — بھیانک جنگل ہے جو  
غمگساری کا فرض انجام دے رہا ہے اور ایسے میں علیؑ کی بیٹی ہے جو ایک  
ایک بی بی کو سمجھا رہی ہے۔ کبھی لیلی کو ان کے لال کا پرمسہ دیتی ہے۔  
کبھی ام فروہ کے ساتھ بیٹھ کر قاسم کا ماتم کرتی ہے۔ کبھی رباب کے  
ساتھ اصنفر کا ماتم کرتی ہے۔ کبھی فرات کی طرف نظر مڑ جاتی ہے، تو  
عیاشؓ کو یاد کرتی ہے۔ اور کبھی ہجوم مصائب سے ایک لمحہ کی  
فرضت ملتی ہے تو اپنے حسینؓ کو یاد کرتی ہے۔ اور ایسے ہیں کبھی  
کبھی عون و محمدؓ کی یاد آواز دیتی ہے اماں — اسی مقتل میں ہم بھی ہیں  
اماں آئیے، ہمیں بھی گلے لگا لیجیے — اماں! آئیے دولحدہ کے لیے  
ہمارے پاس بھی بیٹھ جائیے۔

ہائے زینیت — خدا کسی کو ایسا بیکس نہ بنائے جیسے زینیت  
— کون تھا جو زینیت کو سہارا دیتا —؟ کون تھا جو اس درد کا انراہ  
کرتا —؟ کس کے پہلو میں ایسا دل تھا جو بیٹیوں کے غم کا احساس کرتا  
— ہاں، روایت کا اشارہ ہے کہ ایک مرتبہ علیؑ کی بیٹی نے کسی کو آتے  
ہوتے دیکھا — آواز دی اے سوار! ادھر قدم آگے نہ بڑھانا —

ہمارے پچھے دکھ درد اٹھا کر سوگئے ہیں ۔ ہمارے تجھے لٹ پچکے ہیں۔  
ایسا نہ ہو کہ ہمارے بچوں کی نیند اچٹ جائے ۔ اگر تجھے کچھ لینا ہی ہے  
تو صبح کو آکر جو کچھ ہو لے لینا ۔ اس وقت بچوں کو سولینے دے ۔

علیٰ کی بیٹی فریاد کر رہی ہے اور سوار کچھ نہیں سُنتا ۔ آگے  
بڑھتا چلا آتا ہے ۔ ایک مرتبہ جیسے ہی سوار قریب آیا ۔

شیرِ ذوالجلال کی بیٹی کو جلال آگیا۔ بڑھ کر لحاظ فرس پر بہادر ڈال دیا  
۔ اے سوار میں بار بار کہہ رہی ہوں اور سُنتا ہیں ہے ۔ ارے  
میرا عباس شنید ہو گیا ہے، میرا اکابر مر گیا ہے، میرے عنون و محمد نہیں رہے  
میرا قاسم پامال ہو گیا ہے۔ تو کیا تو سمجھتا ہے کہ میں بالکل یہ لبس ہو گئی  
ہوں ۔ یہ میں علیٰ کی بیٹی ہوں ۔ میرے پہلو میں شیرِ ذوالجلال کا دل ہے  
۔ یہ سُنتا تھا کہ ایک مرتبہ سوار نے چہرہ سے نقاب اُٹ دی ۔

ارے میری زینب تو نے پہچانا نہیں ۔ میں تیرا باب علیٰ ہوں علیٰ۔  
باب کا چہرہ دیکھنا تھا کہ بیٹی قدموں سے پیٹ گئی۔ بایا۔ اب  
آئے ہو جب گھر لٹ گیا۔ اب آئے جب خیجے جل گئے ۔ اب آئے  
جب چادریں چھن گئیں ۔ اب آئے جب بھیا کے گلے پر خنجر چل گیا۔  
۔ اب آئے جب سکینہ طلبانچے کھا کر سو گئی ۔ اصلہ کا جھولا دیران  
ہو گیا، اور سید انیاں بے والی ووارث ہو گئیں

وہ تھا سمجھے نہ علیٰ اکبرے نہ عباسے ۔

باب نے بیٹی کی داستان سنی۔ دل کو سنبھالا۔ آدار ذی

زینیٹ - ! ٹھہر و ٹھہر - بیٹی ! دل کو سن بھاولو - تم پیٹھواں  
باپ نگرانی کرے گا۔

عز ادارو ! کون جانتا ہے کہ علیؑ کب آئے اور زینیٹ کی ذمہ داریا  
کب ختم ہوئیں - ہاں مقتل میں اتنا ضرور ملتا ہے کہ اسی رات کے  
سننالے میں ایک مرتبہ زینیٹ اپنے بھیتا کی امانت سکینہ کو تلاش کرنے  
نکلی تھی اور جب ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک لشیب کے قریب پہنچی  
تھی تو ہاں سے کسی بچی کے روئے کی آواز آرہی تھی۔ جناب زینیٹ اور  
جناب اُم کلتوں آگے بڑھیں، کیا دیکھا۔ سکینہ ایک لاشہ بے سر سے پیٹی  
ہوئی بین کر رہی ہے - بایا - ! میں لٹکتی - بایا - ! میں تم سے  
چھٹکتی - بایا - ! گوشوارے چھن گئے - بایا - ! ذرا اٹھ کے دیکھو  
یہ رخسار شمر کے طماںچوں سے نیلے ہو گئے ہیں۔

ثانی زہر آگے بڑھیں - بچی کو اٹھایا - پوچھا سکینہ یہ کس  
کا لاشہ ہے - ؟ کہا پھوپھی اماں ! یہ میرا بایا ہے - کہا بیٹی  
اس لاشہ پر تو سر بھی نہیں ہے۔ اس کا لباس بھی لٹکیا ہے۔ تو  
نے کیسے پہچانا - ؟ کہا پھوپھی اماں جب رات کی تاریکی نے ستایا  
تومیں مقتل میں بایا کو ڈھونڈتی ہوئی آئی - آواز دے رہی تھی -  
بایا - ! متحاری سکینہ آرہی ہے - بایا، کہاں ہو بایا - اپنی سکینہ  
کو اپنے پاس بلالو - ایک مرتبہ اس لاشہ بے سر سے آواز آئی -  
اوے سکینہ آؤ - تیرا بایا پ اس لشیب میں ہے - پھوپھی اماں !

میں بایا کے لاشے سے لیٹی ہوئی بین کر رہی تھی تو ایک مرتبہ کٹی ہوئی گردان  
 سے آواز آئی۔ سکینہ ٹھہرو۔ ٹھہرو سکینہ۔ سکینہ میرا ایک پیغام  
 لیتی جاؤ۔ سکینہ! میرے شیعوں تک میرا سلام پہونچا دینا، اور کہتا  
 چاہئے والو! جب مھنڈا پانی پیتا تو مجھ پسکیں کی پیاس کو یاد کر لینا۔ اور  
 جب کسی غریب و پسکیں کا ذکر آئے تو مجھ پر اس طرح آنسو بہانا جیسے  
 میری ماں فاطمہ زہراؓ بین کرتی ہیں۔ ارے میرے لال۔ ارے  
 میرے حسین! واغرستاہ۔ واحسیناہ  
 حسین۔ حسین۔ حسین

---

# ذکر مظلوم

خطیب آل محمد سید قائم مہدی صاحب قبلہ کی نئے  
ذکریں کے لئے بے مثال و لاجواب کتاب جسے یہ  
یحیم محرم تا دس محرم، شہداء کے کربلا، جناب سکینہ، جناب  
زینب اور نام آئندہ معصومین علیہ السلام کی شہادتوں پر  
چالیس تاریخ دار مجلس انتہائی آسان اور سہل زبان ہیں  
درج کی گئی ہیں۔ ان مجلس میں محمد و آل محمد علیہم السلام کے  
عظیم اشان فضائل اور پر در درقت امیز مصادب تاریخی مناسبت  
سے بیان کئے گئے ہیں۔ ذکری کا شوق رکھنے والے پھر اس  
کے لئے اس سے بہتر کوئی درسری کتاب نہیں۔

ملنے کا پتہ

احمد بک ٹپو امام بارگاہ رضویہ سوسائٹی کراچی ۱۸